و لله المشرق و المغرب

اقبال

پیام مشرق

منظوم ترجمہ

مصنطر مجاز

ناشر

اقبال اکیڈیمی

حیدرآباد

اقبال

پیام مشرق

جرمن شاعر گوئیٹے کے "دیوان مغرب" کے جواب میں

منظوم ترجمہ

مضطر مجاز

E Books
WHATSAPP GROUP
آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل
عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

ناشر

اقبال اکیڈیمی
حیدر آباد

Payam - e - Mashrique (IQBAL)

Versified URDU Translation

By

MUZTAR MAJAZ

اشاعت : اول جولائی ۱۹۹۶ء

تعداد : ۱۰۰۰

کمپیوٹر کمپوزنگ : ممتاز جہاں بیگم

تزئین و تشکیل : حمید خاں

مطبع : اسپیڈ پرنٹس سعید آباد، حیدر آباد - ۵۹

فون نمبر 4063538

قیمت : ۱۴۰ روپے

(ملنے کے پتے)

۱ - اقبال اکیڈمی، مدینہ مینشن، نارائن گوڑہ، حیدر آباد - ۱

۲ - الکتاب بک سیلرز گن فاونڈری، حیدر آباد - ۱

۳ - سب رس کتاب گھر سوماجی گوڑہ، حیدر آباد - ۴

۴ - حسامی بک ڈپو چارمینار حیدر آباد - ۲

۵ - مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی - بھنڈی بازار بمبئی

۶ - شب خون کتاب گھر 313 ، رانی منڈی الہ آباد - ۳

۷ - سیاست سیلز کاونٹر عابد روڈ، حیدر آباد - ۱

۸ - ادارۂ شگوفہ 31 - ٹیچرز کوارٹرز، حیدر آباد - ۱

۹ - مصنف 16-1-24/A7 سعید آباد، حیدر آباد - ۵۹

E Books
WHATSAPP GROUP

انتساب

عزیز از جاں

محمد یوسف الدین خاں

اور

یار خوش خصال

ڈاکٹر یوسف کمال

کے نام

E Books
WHATSAPP GROUP

فہرست

شمار	نظم	صفحہ نمبر
۱	انتساب	۳
۲	پیش لفظ	۷
۳	عرض مترجم	۱۰
۴	دیباچہ	۱۳
۵	پیش کش	۲۱
	لالۂ طور	
۶	(رباعیات)	۲۹
	افکار	
۷	پہلا پھول	۷۳
۸	دعا	۷۴
۹	ہلال عید	۷۴
۱۰	تسخیر فطرت	۷۵
۱۱	خوشبو	۸۰
۱۲	نوائے وقت	۸۱
۱۳	حیات جاوید	۸۲
۱۴	فصل بہار	۸۳
۱۵	افکار انجم	۸۶
۱۶	زندگی	۸۷
۱۷	علم اور عشق کے درمیان مکالمہ	۸۸
۱۸	تاروں کا گیت	۸۹
۱۹	نسیم صبح	۹۱
۲۰	باز کی نصیحت اپنے بچے کو	۹۲
۲۱	کتاب کا کیڑا	۹۳
۲۲	کبر و ناز	۹۴
۲۳	لالہ	۹۵
۲۴	حکمت و شعر	۹۶
۲۵	حقیقت	۹۶
۲۶	جگنو	۹۷
۲۷	حدی (ساربان حجاز کا گیت)	۹۹
۲۸	بارش کا پہلا قطرہ	۱۰۲
۲۹	خدا اور انسان کے درمیان ایک مکالمہ	۱۰۳
۳۰	ساقی نامہ	۱۰۴
۳۱	شاہین و ماہی	۱۰۵
۳۲	تنہائی	۱۰۶
۳۳	شبنم	۱۰۷
۳۴	جگنو	۱۰۹
۳۵	عشق	۱۱۰
۳۶	اگر جینا ہے خطروں سے الجھ جا	۱۱۲
۳۷	جہان عمل	۱۱۳
۳۸	زندگی	۱۱۴
۳۹	حکمت فرنگ	۱۱۵
۴۰	حور و شاعر	۱۱۶

E Books
WHATSAPP GROUP

۴۱	تہذیب	۱۱۷
۴۲	زندگی و عمل	۱۱۸
۴۳	الملک للہ	۱۱۸
۴۴	جوئے آب	۱۱۹
۴۵	عالمگیرؒ کا خط	۱۲۰
۴۶	بہشت	۱۲۰
۴۷	کشمیر	۱۲۱
۴۸	عشق	۱۲۱
۴۹	بندگی (عبدیت)	۱۲۲
۵۰	غلامی	۱۲۲
۵۱	چیستان شمشیر	۱۲۳
۵۲	جمہوریت	۱۲۳
۵۳	فرنگستان میں مبلغ اسلام	۱۲۴
۵۴	غنی کشمیری	۱۲۵
۵۵	مصطفیٰ کمال پاشا سے خطاب	۱۲۶
۵۶	طیارہ	۱۲۷
۵۷	عشق	۱۲۷
۵۸	مے باقی (غزلیات)	۱۳۱ تا ۱۶۶
	نقش فرنگ	
۵۹	پیام	۱۶۹
۶۰	آزادیٔ بحر	۱۷۴
۶۱	جمعیت الاقوام	۱۷۵
۶۲	شوپن ہار و نیٹشا	۱۷۵

۶۳	فلسفہ و سیاست	۱۷۶
۶۴	صحبت رفتگان	۱۷۶
۶۵	جلال و ہیگل	۱۷۹
۶۶	نیٹشا	۱۷۹
۶۷	حکیم آئن سٹائن	۱۸۰
۶۸	بائرن	۱۸۱
۶۹	نیٹشا	۱۸۲
۷۰	پٹوفی	۱۸۳
۷۱	فرانسیسی فلسفی آگسٹس کومٹ اور مزدور کے درمیان ایک مکالمہ	۱۸۳
۷۲	ہیگل	۱۸۵
۷۳	جلالؒ و گوئٹے	۱۸۵
۷۴	پیغام برگساں	۱۸۶
۷۵	مئے خانہ فرنگ	۱۸۶
۷۶	موسیولینن و قیصر ولیم	۱۸۷
۷۷	حکما	۱۸۸
۷۸	شعرا	۱۸۹
۷۹	خرابات فرنگ	۱۹۰
۸۰	انگلستان خطاب	۱۹۱
۸۱	قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور	۱۹۱
۸۲	نوائے مزدور	۱۹۲
۸۳	متفرقات (گہر ریزے)	۱۹۳
۸۴	اشارات	۱۹۷

E Books
WHATSAPP GROUP

کلام اقبال کے تراجم

(ایک جائزہ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیائے ادب میں اجالا شعری و ادبی تخلیق کاری ہی سے پھیلتا ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ مختلف ممالک اور معاشروں کے درمیان فکری استحسان اور تہذیبی لین دین کے لئے ترجے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ ترجمہ اور وہ بھی ادبی تخلیق کا ترجمہ کتنا ہی مشکل بلکہ بعض نقادوں کے مطابق ناممکن ہی سہی،، بہرحال یہ ایک ایسی تہذیبی اور فکری ضرورت ہے کہ جس کے بغیر دنیائے فکر و ادب بوقلمونی اور رنگا رنگی سے محروم ہو کر سپاٹ ہوجائے اور مختلف معاشروں کا تخلیقی جینیس ایک دوسرے سے نابلد رہ کر اجنبیت اور ISOLATION کا شکار ہوجائے۔ اس خصوص میں شاعر مشرق علامہ اقبال کا مجموعہ کلام "پیام مشرق" بجائے خود اس کی ایک روشن مثال ہے۔ یہ مجموعہ اقبال نے جرمنی کے شہرۂ آفاق شاعر گوئٹے کے "دیوان مغرب" کے جواب میں ترتیب دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گوئٹے نے "دیوان مغرب" فارسی کے مشہور شاعر حافظ سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ گوئٹے فارسی سے ناواقف تھا لیکن اس نے دیوان حافظ کا مطالعہ فان ہیمر کے جرمن ترجے کے ذریعے کیا تھا اور اسی ترجے سے وجدان حاصل کرکے اس نے "دیوان مغرب" تصنیف کیا۔ تراجم کے ذریعے وجدان حاصل کرنے کا یہ زنجیری سلسلہ حافظ کے جرمن ترجے سے شروع ہو کر اقبال کے "پیام مشرق" سے ہوتا ہوا مضطر مجاز کے زیر نظر "پیام مشرق" کے اردو ترجے تک صاف نظر آتا ہے۔

اپنے غیر معمولی مبسوط فکر و فلسفہ اور چونکا دینے والے شاعرانہ اسلوب کی بنا پر اقبال نے اپنی زندگی ہی میں مترجمین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا چنانچہ ۱۹۲۰ء ہی میں خود اقبال کے استاد اے۔ آر نکلسن نے "اسرار خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا جس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ترجے کے اب تک کوئی بارہ ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ اقبال کے انگریزی مترجمین میں نکلسن کی حیثیت تو خضرراہ جیسی ہے کیونکہ ان سے متاثر ہو کر اے۔ جے آربری نے "جاوید نامہ" "زبور عجم" "لالہ طور" کے علاوہ "شکوہ اور جواب شکوہ" کا ترجمہ کیا۔ ایک انگریز مترجم جس نے اقبال کے منتخب کلام کا ترجمہ کیا وہ ہے کیرنن (KIERANAN) جو بعد میں فیض

احمد فیض کے مترجم کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہوا۔ ان غیر ملکی مترجمین کے علاوہ اقبال کے ہندوستانی اور پاکستانی انگریزی مترجمین کی فہرست میں الطاف حسین، بشیر احمد ڈار، نیاز صوفی، عبدالرحمان طارق اور خوشونت سنگھ وغیرہ ہیں۔ جرمن مستشرق اور ماہر اقبال پروفیسر انامیری شیمیل نے اقبال کے "جاوید نامہ" اور "بال جبریل" کا ترجمہ جرمن اور ترکی زبان میں کیا۔ مشہور اطالوی اسکالر السیندرو بوسانی نے "گلشن راز جدید" اور "جاوید نامہ" کے علاوہ "پیام مشرق" "ضرب کلیم" اور زبور عجم" کی منتخب منظومات کو اطالوی زبان میں منتقل کیا۔ ان کے علاوہ جن دوسری مغربی زبانوں میں اقبال کے تراجم ہو چکے ہیں ان میں فرانسیسی، چیک، سویڈش، روسی اور ترکی بھی شامل ہیں۔ یوروپی زبانوں کے علاوہ ایشیا کی جن اہم زبانوں میں اقبال کے تراجم ہو چکے ہیں ان میں چینی، انڈونیشیائی، عربی اور فارسی شامل ہیں برصغیر کی جن مختلف زبانوں میں اقبال کے تراجم دستیاب ہیں ان میں پنجابی، پشتو، بنگالی، گجراتی، سندھی، کشمیری اور ہندی شامل ہیں اس طرح دنیا کی تقریباً ساٹھ زبانوں میں اقبال کے منظوم یا منثور ترجمے ہو چکے ہیں۔

اردو زبان کے شعری سرمائے میں اقبال کی حیات فکر، فن اور شعور کا مطالعہ بجائے خود ایک علاحدہ شعبہ تحقیق کی صورت اختیار کر چکا ہے اس لئے اقبالیات کے میدان میں اقبال کے فارسی کلام کے اردو تراجم کی ضرورت ہمیشہ سے ہی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ ان کوششوں کا آغاز اقبال کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔ چنانچہ شبیر علی سرخوش کا ترجمہ "پیام مشرق" (مخمس) بہ عنوان "پیام مشرق" ۱۹۲۳ء ہی میں شائع ہو چکا تھا۔ گذشتہ ستر سال کے عرصے میں شاعر مشرق کے کلام کے کم و بیش بیس اردو تراجم شائع ہو چکے ہیں جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) جاوید نامہ: مترجمہ انعام اللہ خان ناصر (۱۹۶۶ء)، رفیق خاور (۱۹۷۶ء) مضطر مجاز (۱۹۸۱ء)

(۲) پیام مشرق: شبیر علی سرخوش، (۱۹۲۳ء)، عبدالرحمان طارق (۱۹۵۲ء)، فیض احمد فیض (منتخب منظومات) (۱۹۷۷ء)، عصمت جاوید (۱۹۹۱ء) منثور، مضطر مجاز (۱۹۹۶ء) (زیر نظر)

(۳) اسرار خودی: جسٹس ایس۔ اے رحمان (۱۹۵۲ء) عبدالرشید فاضل (۱۹۵۶ء) عصمت جاوید (۱۹۹۱ء)

(۴) زبور عجم: جسٹس ایس۔ اے رحمان (۱۹۷۷ء)، عبدالرحمان طارق (؟)

(۵) پس چہ باید کرد: ظفر احمد صدیقی (۱۹۵۵ء) مضطر مجاز (۱۹۷۵ء)، رفیق خاور (۱۹۷۷ء)

(۶) ارمغان حجاز: عبدالرحمان طارق (۱۹۵۰ء) مضطر مجاز (۱۹۷۵ء) منور لکھنوی (۱۹۷۸ء)

اقبال کے فارسی کلام کے اردو مترجموں کی اس کہکشاں میں ہر مترجم ایک روشن ستارے کی طرح تفہیم اقبال کی روشنی بکھیر رہا ہے۔ مترجموں کی اس فہرست میں کچھ نامی گرامی شاعر بھی ہیں اور کچھ علم و فضل کے ایسے متوالے ہیں جنھوں نے اپنا سارا فکری سرمایہ اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے میں کی سعی میں صرف کیا۔ مضطر مجاز بھی ان میں سے ایک ہیں جو خود ایک شیوا بیان شاعر ہونے کے

ساتھ ساتھ اس ہند اسلامی تہذیب کے اقدار اور ETHOS کے وارث اور عارف ہیں جس کی ترویج و ترسیل سے اقبال کی ساری تخلیقی کاوشیں عبارت ہیں ۔ ایک پختہ مشق شاعر ہونے کے ناطے مضطر زبان بیان اور اظہار کے مختلف اسالیب کو برتنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ اقبال کے اس تخلیقی کرب کو اپنے اظہار کی گرفت میں لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں جس کو شاعر مشرق نے اپنی غیر معمولی قادر الکلامی اور منفرد لفظیات اور محاکات کے ذریعے مخصوص اسلوب اظہار کا پیراہن عطا کیا تھا ۔

مضطر مجاز مترجمین اقبال میں غالباً واحد مترجم ہیں جنھوں نے اقبال کے چار فارسی مجموعوں کا اردو میں مکمل منظوم ترجمہ کیا ۔ اس کمیت کے ساتھ ساتھ کیفیت کے لحاظ سے بھی یہ ترجمے بجائے خود ایک تخلیقی شان رکھتے ہیں ۔ ان تراجم کو پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ مترجم نے تخلیق کار کے فکر و فن کو کچھ اس قدر اپنے اندر جذب کرلیا ہے کہ بعض تراجم پر طبعزاد کلام کا گمان ہوتا ہے ۔ مترجم کے ساتھ ساتھ ایک سنجیدہ محقق کی حیثیت سے بھی انھوں نے حواشی اور اشارات کے ذیل میں خاصہ علمی مواد بھی مہیا کردیا ہے جن میں تاریخی حوالے ، قرآنی تلمیحات ، مشرقی اور مغربی مفکروں اور علماء کے مختصر خاکے وغیرہ شامل ہیں ۔

" پیام مشرق " اقبال کے فکری سفر میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے ۔ انا میری شیمیل " پیام مشرق " کو اقبال کے فکری سفر میں ایک اہم سنگ میل گردانتی ہیں کہ اس زمانے میں (۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۳ء) اقبال کی فکر نے مغرب سے ایجابی اثرات قبول کئے ۔

امید ہے کہ اپنی ادبی اور معنوی اہمیت کے پیش نظر " پیام مشرق " کا یہ اردو ترجمہ اقبال کے ان طالب علموں کے لئے ایک سوغات سے کم ثابت نہ ہوگا جو فارسی زبان سے ناواقفیت کی بناء پر اس اہم فن پارے سے استفادہ کرنے سے اب تک محروم تھے ۔

۲۹ / جولائی ۱۹۹۶ء

پروفیسر (ڈاکٹر) یوسف کمال

عثمانیہ یونیورسٹی ، حیدرآباد ۔
آندھرا پردیش

عرضِ مترجم

دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ترجمے کی حیثیت ثانوی اور ذیلی رہی ہے جب کہ یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ساری دنیا میں علم و حکمت کا فروغ ترجمے ہی کا مرہونِ منت ہے۔ قدیم مصری ادیب ارار اسونب سے ارسطو تک اور سقراط سے سارتر تک کسی بھی عظیم فلسفی، شاعر، اور دانش ور سے صرف اور صرف ترجمے کی مدد ہی سے ہم متعارف ہو سکے ہیں۔ تخلیق تو ایک ایسا وجدانی عمل ہے جس سے فن کار چٹکی بجاتے گذر جاتا ہے۔ خود اقبال نے ایک جگہ اسے دردِ زہ یا جنسی تحریک کے ٹینشن سے تعبیر کیا ہے چنانچہ تخلیقی عمل کی تکمیل کو انھوں نے تسکین کا باعث بھی بتایا ہے۔ لیکن مترجم کی مشکلات تو چند در چند ہیں اس کو اس شعور اور لاشعور کے درمیانی دھندلکے سے اپنے آپ کو شعوری طور پر گذارنا پڑتا ہے جس سے فن کار وجدانی سطح پر بہ آسانی گذر چکا ہوتا ہے یہی وہ دشوار گذار راہ ہے جہاں مترجم فن کار کے تخلیقی سفر کے اسود و ابیض (لاشعور و شعور) سے اپنے آپ کو گذارتا ہے تو وہیں بقول ایذرا پونڈ خود اپنی زبان کے نشیب و فراز سے بھی آگاہ ہوتا ہے ترجمے کے عمل کی ایسی پیچ در پیچ جکڑ بندیوں کے باعث دنیا کا کوئی مترجم اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کا ترجمہ اکمل اور اصل کا نعم البدل ہے ترجمہ زیادہ سے زیادہ اصل فن پارے کی تفہیم و تحسین میں معاون ہو سکتا ہے اس کا نعم البدل نہیں۔ یہ محض ایک آئینہ ہے جس میں مترجم قاری کو فن پارے کے حسنِ اصلی کی جس قدر زیادہ جھلک دکھلا سکے اسی قدر وہ کامیاب ہے۔ ترجمے کا نعم البدل بننا اس لئے بھی ممکن نہیں کہ ہر زبان اپنا ایک پیچیدہ تشکیلی نظام رکھتی ہے جس میں اس کی قومی تاریخ کے زیرِ اثر مقررہ تہذیبی اقدار، سماجی تخصیصات، مخصوص استعاراتی اور تلمیحاتی نظام اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیگر زبانوں کے مقابل فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ سب سے زیادہ ممکن العمل ہے کیونکہ دونوں زبانوں کا تہذیبی، تلمیحاتی اور استعاراتی نظام بڑی حد تک مشترک ہے۔

اس ساری دراز نفسی کا یہ مطلب نہیں کہ راقم الحروف زیرِ نظر ترجمے میں اپنے عجزِ اظہار کے لئے کوئی اعتذار پیش کر رہا ہے۔ مقصود صرف اس قدر ہے کہ فارسی زبان کے اس عظیم شاعر کے اس عظیم فن پارے کے ترجمے کو اصل کا نعم البدل نہ سمجھا جائے۔ اس موقع پر مناسب ہوگا اگر ہم جیارج اسٹنیر (George Steiner) کے یہ معروضات بھی پیشِ نظر رکھیں:

" There can be no exhaustive transfer from language A to language B. no meshing of nets so precise that there is:

(i) identity of conceptual content.

(ii) Unison of under tone&

(iii) absolute symmetry of aural & visual associates.

اس لحاظ سے شاعری کا ترجمہ شاعری میں اور مشکل ہے خصوصاً اقبال جیسے عظیم شعرا کے یہاں نہ صرف صوتی محاکات بلکہ سمعی (aural) اور بصری (Visual) پیکر تراشی اتنی افراط سے پائی جاتی ہے کہ اس کو گرفت میں لینا آسان کام نہیں۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ ترجمے کا منظوم ہونا ہی کیا ضروری ہے اس کا جواب ہمیں خود اقبال کے یہاں ملتا ہے کہ ؎

صد نالۂ شب گیرے ، صد آہِ شرر ریزے
صد صبح بلا خیزے ، یک شعرِ دل آویزے!

شعر کی تاثیر بہرحال اپنی جگہ مسلم ہے کہ ؎

یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے!

ادبی اور شعری تراجم کی اولین شرط اس کا نہ صرف وفادار ہونا ہے بلکہ خوبصورت ہونا بھی ہے اور خوبصورتی اور وفاداری ایک ساتھ مشکل ہی سے جمع ہوتے ہیں، بہرحال جہاں کہیں یہ آپ کو یکجا نظر آئیں آپ خط اندوز ہوں ورنہ مترجم کے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں کوئی اور صاحب ہمت مترجم اس کام کو بہ احسن الوجوہ انجام دے جائے کہ ؎

راہِ مضمون تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے باب سخن!

جہاں تک ترجمے کے ڈکشن کا تعلق ہے مجھے صرف اسقدر عرض کرنا ہے کہ حتی المقدور یہ کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ معیارات کا لحاظ کرتے سہل اور سرل لفظیات سے کام لیا جائے لیکن مشکل اقبال کے "بحرِ خیالات کے گہرے پانی" سے بھی ہے کہ ان کے لئے ہماری فلموں اور ٹی۔ وی سیریلوں والی زبان کچھ زیادہ موزوں اور مناسب نہیں بلکہ اس سے نہ صرف مطلب کے خبط ہو جانے بلکہ مضحکہ خیز ہو جانے کا بھی احتمال ہے چنانچہ اس میں فلمی سے زیادہ علمی زبان کو اظہار مطالب کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ آسان فارسی کا مشکل اردو ترجمہ نظر آئے۔ لیکن بہ ہر حال یہ ایک سنجیدہ فن پارہ ہے جس کی تحسین کے سلسلے میں قارئین سے بھی کسی نہ کسی حد تک محنت اور دماغ سوزی کی توقع رکھنا بیجا نہ ہوگا کیونکہ یہ بہرحال وہ شاعری نہیں جو دفع الوقتی اور ذہنی تفریح کے لئے پڑھی جاتی ہے۔

زیر نظر کتاب جہاں اقبال کے فلسفیانہ خیالات بلکہ صوفیانہ اور روحانی تجارب (لالۂ طور و مئے باقی) سے مملو ہے وہیں اس میں سماجی، قومی اور بین الاقوامی مسائل و مصائب پر ان کا فکری، جذباتی اور احساساتی رد عمل (افکار اور نقش فرنگ) بھی محفوظ ہوگیا ہے اس طرح اس کتاب کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ اس میں دو سمندروں کا ملاپ نظر آتا ہے --- مرج البحرین یلتقیٰن ---- جو اس قدر واضح انداز میں ان کی کسی دوسری تصنیف میں نہیں ملتا۔ مشرق و مغرب کے علم و حکمت کو کھنگالنے کے بعد جو ان کے دل میں درد و کرب کی لہریں اٹھیں ان کے ارتسامات اس کتاب میں ملیں گے۔ رہ گئی دانتے کے "دیوان مغرب" کے جواب والی بات اس پر خود اقبال نے اپنے دیباچے اور "پیش کش" میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس میں کسی طرح کا کوئی اضافہ کرنا مجھ جیسے ہیچ میرز و ہیچ مداں کی بضاعت سے باہر ہے۔

میں عزیز دوست جناب ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈمی کا بھی شکر گذار ہوں کہ ان کی دلچسپی کے باعث اقبال اکیڈمی نے اس کتاب کی طباعت اور اشاعت کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ قبل ازیں میرا جاوید نامہ کا منظوم ترجمہ بھی اکیڈمی شائع کر چکی ہے۔

میں اپنے عزیز دوست پروفیسر ڈاکٹر یوسف کمال کا بھی ممنون ہوں کہ جنھوں نے نہ صرف میری علمی کاوشوں اور شعری سفر میں ہمیشہ میری ہمت بندھائی بلکہ یہی کتاب نہیں ہر کتاب کی طباعت اور اشاعت کے مختلف مراحل میں اپنے مفید مشوروں سے مجھے نوازا۔ دیرینہ رفیق شفیق محمد یوسف الدین خاں (حال مقیم لندن) کے شکریے کے لئے شاید مجھے الفاظ نہ ملیں کہ ان کا مخلصانہ تعاون مجھے نہ ملتا تو پتہ نہیں یہ کام اور کتنے سال یونہی پڑا رہتا

اس سلسلے میں میرا کچھ کہنا تحصیل حاصل ٹھہرے گا۔ بقول مولانا جامیؔ ؎

حق راز حق شناس نہ از حجت و قیاس
خورشید راچہ حاجتِ شمع است و مشعلہ

مضطر مجاز

16-1-24/A-7
سعید آباد
حیدر آباد 5000 59

۱۶/ جولائی ۱۹۹۶ء

دیباچہ

"پیام مشرق" کی تصنیف کا محرک "حکیم حیات" گوئٹے کا "مغربی دیوان" ہے جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر ہائنا لکھتا ہے:

"یہ ایک گلدستۂ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے.........

اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے"۔

گوئٹے کا یہ مجموعۂ اشعار جو اس کی بہترین تصانیف سے ہے اور جس کو اس نے خود "دیوان" کے نام سے موسوم کیا ہے کن اثرات کا نتیجہ تھا اور کن حالات میں لکھا گیا؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختصر طور پر اس تحریک کا ذکر کیا جائے جس کو المانوی ادبیات کی تاریخ میں "تحریک مشرقی" کے نام سے یاد کرتے ہیں میرا قصد تھا کہ اس دیباچے میں تحریک مذکور پر کسی قدر تفصیل سے بحث کروں گا مگر افسوس ہے کہ بہت سا مواد جو اس کے لیے ضروری تھا ہندوستان میں دستیاب نہ ہو سکا پال ہورن، تاریخ ادبیات ایران کے مصنف نے اپنے ایک مضمون میں اس امر پر بحث کی ہے کہ گوئٹے کس حد تک شعرائے فارس کا ممنون ہے۔ لیکن رسالہ نارو اَنڈ سوڈ کا وہ نمبر جس میں مضمون مذکور شائع ہوا تھا نہ ہندوستان کے کسی کتب خانے سے مل سکا نہ جرمنی سے۔ مجبوراً اس دیباچے کی تالیف میں کچھ تو گذشتہ مطالعہ کی یادداشت پر بھروسا کرتا ہوں اور کچھ مسٹر چارلس ریمی کے مختصر مگر نہایت مفید اور کارآمد رسالے پر جو انھوں نے اس موضوع پر لکھا ہے۔

ابتدائے شباب ہی سے گوئٹے کی ہمہ گیر طبیعت مشرقی تخیلات کی طرف مائل تھی۔ سٹراس برگ میں جہاں وہ قانون کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ اس کی ملاقات جرمن لٹریچر کی مشہور اور قابل احترام شخصیت ہرڈر سے ہوئی جس کی صحبت کے اثرات کو گوئٹے نے خود اپنے سوانح میں تسلیم کیا ہے۔ ہرڈر فارسی نہ جانتا تھا لیکن چونکہ اخلاقی

رنگ اس کی طبیعت پر غالب تھا اس لیے سعدی کی تصانیف سے اسے نہایت گہری دلچسپی تھی ۔ چنانچہ "گلستاں" کے بعض حصوں کا اس نے جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے ۔ خواجہ حافظ کے رنگ سے اسے چنداں لگاؤ نہ تھا ۔ اپنے معاصرین کو سعدی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتا ہے "حافظ کے رنگ میں ہم بہت کچھ نغمہ سرائی کر چکے ۔ اس وقت سعدی کے تلمذ کی ضرورت ہے" ۔ لیکن باوجود اس دلچسپی کے جو ہرڈر کو مشرقی لٹریچر سے تھی اس کے اپنے اشعار اور دیگر تصانیف پر مشرقی لٹریچر کا کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا ۔ علیٰ ہذالقیاس گوئٹے کا دوسرا معاصر شلر بھی جو مشرقی تحریک کے آغاز سے پہلے ہی مر چکا تھا مشرقی اثرات سے آزاد ہے گو اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اس کے ڈراما "توران دخت" کا پلاٹ مولانا نظامی کے افسانۂ دخترِ پادشاہِ اقلیمِ چہارم (ہفت پیکر) سے لیا گیا ہے ۔ جس کا آغاز مولانا نے اس شعر سے کیا ہے

"گفت کز جملۂ ولایتِ روس
بود شہرے بہ نیکوئی چو عروس"

۱۸۱۲ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اسی ترجمہ کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا ۔ گوئٹے کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا ۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لیے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن و سکون میں اپنے لیے ایک نشیمن تلاش کر لیا ۔ حافظ کے ترنم نے اسکے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم برپا کر دیا ۔ جس نے آخر کار "مغربی دیوان" کی ایک پایدار اور مستقل صورت اختیار کر لی مگر فان ہیمر کا ترجمہ گوئٹے کے لیے محض ایک محرک ہی نہ تھا بلکہ اس کے عجیب و غریب تخیلات کا ماخذ بھی تھا ۔ بعض بعض جگہ اس کی نظم خواجہ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے اور بعض جگہ اس کی قوت تخیل کسی خاص مصرع کے اثر سے ایک نئی شاہراہ پر پڑ کر زندگی کے نہایت دقیق اور گہرے مسائل پر روشنی ڈالتی ہے ۔ گوئٹے کا مشہور سوانح نگار بیل سوشکی لکھتا ہے:

" بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی رنگینی مسرت، وہی آسمانی محبت، وہی سادگی، وہی عمق، وہی جوش و حرارت، وہی وسعت مشرب، وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی! غرض کہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب و ترجمان اسرار ہے اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہانِ معنی آباد ہے اسی طرح گوئٹے کے بیساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراج تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا (یعنی حافظ نے تیمور (۱) کو اور گوئٹے نے نپولین کو) اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان و سکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے"۔

خواجہ حافظ کے علاوہ گوئٹے اپنے تخیلات میں شیخ عطار، سعدی فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے۔ ایک آدھ جگہ ردیف و قافیہ کی قید سے غزل بھی لکھی ہے۔ اپنی زبان میں فارسی استعارات بھی (مثلاً "گوہر اشعار" ۔ "تیر مژگان" ۔ "زلف گرہ گیر") بے تکلف استعمال کرتا ہے بلکہ فارسیت کے جوش میں امرد پرستی کی طرف اشارات کرنے سے بھی احتراز نہیں کرتا۔ دیوان کے مختلف حصوں کے نام بھی فارسی ہیں۔ مثلاً مغنی نامہ۔ ساقی نامہ۔ عشق نامہ۔ تیمور نامہ۔ حکمت نامہ وغیرہ۔ باوجود ان سب باتوں کے گوئٹے کسی فارسی شاعر کا مقلد نہیں اور اس کی شاعرانہ فطرت قطعاً آزاد ہے۔ مشرق کے لالہ زاروں میں اس کی نوا پیرائی محض عارضی ہے۔ وہ اپنی

---

(۱) خواجہ حافظ اور تیمور کی ملاقات کی روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ خواجہ کا انتقال تیموری فتح شیراز سے پہلے ہو چکا تھا۔

مغربیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا اور اس کی نگاہ صرف انھیں مشرقی حقائق پر پڑتی ہے، جن کو اس کی مغربی فطرت جذب کر سکتی ہے۔ عجمی تصوف سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی اور گو اسے یہ بات معلوم تھی کہ مشرق میں خواجہ حافظ کے اشعار کی تفسیر تصوف کے نقطہ نگاہ سے کی جاتی ہے، وہ خود تغزل محض کا دلدادہ تھا اور کلام حافظ کی صوفی تعبیر سے اسے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ مولانا روم کے فلسفیانہ حقائق و معارف اس کے نزدیک مبہم تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے رومی کے کلام پر غائر نگاہ نہیں ڈالی کیونکہ جو شخص سپونوزا (ہالینڈ کا ایک فلسفی جو مسئلہ وحدت الوجود کا قائل تھا) کا مداح ہو اور جس نے برون (اٹلی کا ایک وجودی فلسفی) کی حمایت میں قلم اٹھایا ہو اس سے ممکن نہیں کہ رومی کا معترف نہ ہو۔

غرض کہ "مغربی دیوان" کی وساطت سے گوئٹے نے جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بعد کے شعرا پلاٹن۔ روکرٹ اور بوڈن سٹاٹ نے اس مشرقی تحریک کو جس کا آغاز گوئٹے کے دیوان سے ہوا، تکمیل تک پہنچایا۔ پلاٹن نے ادبی اغراض کے لیے فارسی زبان سیکھی۔ قافیہ ردیف بلکہ ایرانی عروض کے قواعد کی پابندی سے غزلیں لکھیں۔ رباعیاں لکھیں اور نپولین پر ایک قصیدہ بھی لکھا۔ گوئٹے کی طرح فارسی استعارات مثلاً "عروس گل"۔ "زلف مشکیں"۔ "لالہ عذار" کو یہ بھی بے تکلف استعمال کرتا ہے اور تغزل محض کا دلدادہ ہے۔ روکرٹ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت تینوں زبانوں کا ماہر تھا۔ اس کی نگاہ میں فلسفۂ رومی کی بڑی وقعت تھی اور اس کی "غزلیات" زیادہ تر مولانا روم ہی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ چونکہ السنۂ مشرقیہ کا عالم تھا اس لیے اس کی مشرقی نظم کے مواخذ بھی وسیع تر تھے۔ مخزن الاسرار نظامی۔ بہارستان جامی۔ کلیات امیر خسرو۔ گلستان سعدی۔ مناقب العارفین۔ عیار دانش۔ منطق الطیر۔ ہفت قلزم وغیرہ جہاں جہاں سے حکمت کے موتی ملتے ہیں رول لیتا ہے۔ بلکہ اسلام سے پہلے کی ایرانی روایات و حکایات سے بھی اپنے کلام کو زینت دیتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے بعض واقعات بھی اس نے خوب نظم کیے ہیں۔ مثلاً محمود غزنوی کی موت۔ محمود کا حملۂ سومنات۔ سلطانہ رضیہ وغیرہ۔ گوئٹے کے بعد مشرقی رنگ کا سب سے زیادہ مقبول شاعر بوڈن سٹاٹ ہے۔ جس نے اپنی نظموں کو مرزا شفیع کے فرضی نام سے

شائع کیا۔ یہ چھوٹا سا مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں ۱۴۰ دفعہ شائع ہوا۔ اس شاعر نے عجمی روح کو اس خوبی سے جذب کیا ہے کہ جرمنی میں مرزا شفیع کے اشعار کو لوگ دیر تک فارسی نظم کا ترجمہ تصور کرتے رہے۔ بوڈن سٹاٹ نے امیر معزی اور انوری سے بھی استفادہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں میں نے گوئٹے کے مشہور معاصر ہائنا کا ذکر ارادۃً نہیں کیا۔ اگرچہ اس کے مجموعہ اشعار موسوم بہ "اشعار تازہ" میں عجمی اثر نمایاں ہے اور محمود و فردوسی کے قصے کو بھی اس نے نہایت خوبی سے نظم کیا ہے تاہم بحیثیت مجموعی مشرقی تحریک سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اس کی رائے میں گوئٹے کے "مغربی دیوان" کے سوائے جرمن شعرا کا مشرقی کلام کوئی بڑی وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن عجمی جادو کی گرفت سے جرمنی کے اس آزاد رو شاعر کا دل بھی بچ نہ سکا۔ چنانچہ ایک مقام پر اپنے آپ کو عالم خیال میں ایک ایرانی شاعر تصور کرتے ہوئے جس کو جرمنی میں جلاوطن کر دیا گیا ہو لکھتا ہے:

"اے فردوسی! اے جامی! اے سعدی! تمہارا بھائی زندان غم میں اسیر شیراز کے پھولوں کے لیے تڑپ رہا ہے"۔

کم درجے کے شعرا میں خواجہ حافظ کا مقلد ڈومر۔ ہرمن سٹال۔ لوشکے۔ سٹائگ لٹز۔ لنٹ ہولڈ اور فان شاک بھی قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر علمی دنیا میں اونچا پایہ رکھتا تھا۔ اس کی نظمیں قصہ انصاف محمود غزنوی اور قصہ ہاروت و ماروت مشہور ہیں اور بحیثیت مجموعی اس کے کلام میں عمر خیام کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن مشرقی تحریک کی پوری تاریخ لکھنے اور جرمن اور ایرانی شعرا کا تفصیلی مقابلہ کر کے عجمی اثرات صحیح وسعت معلوم کرنے کے لیے ایک طویل مطالعہ کی ضرورت ہے جس کے لیے نہ وقت میسر ہے نہ سامان۔ ممکن ہے کہ یہ مختصر سا خاکہ کسی نوجوان کے دل میں تحقیق و تدقیق کا جوش پیدا کر دے۔

"پیام مشرق" کے متعلق جو "مغربی دیوان" سے سو سال بعد لکھا گیا ہے مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت

سے ہے ۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لیے نہیں لگاسکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے ۔ یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے ، جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگسان کے تصانیف میں ملتا ہے ۔ یورپ نے اپنے علمی اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں اور سائنیٹی (سابق وزیر اعظم اطالیہ) سے " انحطاط فرنگ " کی دلخراش داستان بھی سن لی ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کے نکتہ رس مگر قدامت پرست مدبرین اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے جو انسانی ضمیر میں اس وقت واقع ہو رہا ہے ۔ خالص ادبی اعتبار سے دیکھیں تو جنگ عظیم کی کوفت کے بعد یورپ کے قوائے حیات کا اضمحلال ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کی نشوونما کے لیے نامساعد ہے ۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ اقوام کی طبائع پر وہ فرسودہ ، سست رگ اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی عجمیت غالب نہ آجائے جو جذبات قلب کو افکار دماغ سے متمیز نہیں کر سکتی ۔ البتہ امریکہ مغربی تہذیب کے عناصر میں ایک صحیح عنصر معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ ملک قدیم روایات کی زنجیروں سے آزاد ہے اور اس کا اجتماعی وجدان نئے اثرات و افکار کو آسانی سے قبول کر سکتا ہے ۔

مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام شرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو ۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لایغیر مابقوم حتیٰ یغیر وامابانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ زندگی

کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مد نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابل احترام ہے۔ اسی بنا پر میں نے ان چند اوراق کو اعلیٰ حضرت فرمانروائے افغانستان کے نام نامی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں اور افغانوں کی تربیت انھیں خاص طور پر مد نظر ہے۔ اس عظیم الشان کام میں خدا تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔

آخر میں میں اپنے دوست چودھری محمد حسین صاحب ایم۔ اے کا سپاس گذار ہوں کہ انھوں نے "پیام مشرق" مسودات کو اشاعت کے لیے مرتب کیا۔ اگر وہ یہ زحمت گوارا نہ کرتے تو غالباً اس مجموعے کی اشاعت میں بہت تعویق ہوتی۔

اقبال

پیش کش

بہ حضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان
فرماں روائے دولتِ مستقلۂ افغانستان
خلّد اللہ ملکہٗ واجلالہٗ

اے امیرِ کامگار ، اے شہریار — نوجواں اور مثلِ پیراں پختہ کار
آنکھ تیری محرمِ رازِ حرم — دل ترے سینے میں مثلِ جامِ جم
تیرے کہساروں سا محکم تیرا عزم — تیری مشکل سہل کر دے تیرا حزم
عزم ہے میرے تخیل سا بلند — ملّتِ صدپارہ کا شیرازہ بند
تو نے سلطانوں سے پائے ارمغاں[1] — لعل و یاقوت اور الماسِ گراں !

اے امیر ، ابنِ امیر ، ابنِ امیر
بے نوا کا تحفہ بھی یہ کر پذیر[2]

رمزِ ہستی مجھ کو سکھلایا گیا — پیکرِ خاکی کو گرمایا گیا
لے کے آیا ہوں نوائے سینہ تاب — بخشتا ہوں عشق کا عہد شباب
پیرِ مغرب شاعرِ المانوی[3] — وہ قتیلِ شیوہ ہائے پہلوی

١- تحفے ٢- قبول ٣- گویٹے

تھا وہ عاشق حسنِ شوخ و شنگ کا — بھیجا مشرق کو سلام افرنگ کا
ہے جواباً میرا یہ پیغامِ شرق — چاند سے میرے ہے روشن شامِ شرق
میں نہیں خودبیں، ہوں خود سے آشنا — آبتاؤں! میں ہوں کون اور وہ ہے کیا
وہ جواں افرنگیوں سے، مثلِ برق — اور مجھے بخشیں تپش پیرانِ شرق
وہ چمن زاد اور چمن پروردہ تھا! — میں شجر ہوں اک زمینِ مردہ کا
وہ چمن کا بلبل اور فردوسِ گوش — میں جرس سادشت میں گرمِ خروش
دونوں دانائے ضمیرِ کائنات — دونوں ڈھونڈیں موت کے اندر حیات
دونوں گوہر ارجمند اور تاب دار — زادۂ دریائے ناپیدا کنار
وہ تہہِ قلزم تپاں شوخی سے تھا — چاک سیپی کا گریباں کردیا
میں ابھی سیپی میں گرمِ تاب ہوں — بحر کے دل میں ابھی نایاب ہوں
مجھ سے بیگانہ مرا ہر آشنا — میری مے سے اس نے ساغر کب بھرا؟
میں اسے دیتا ہوں شانِ خسروی — زیرِپا رکھتا ہوں اک تختِ کَی[1]
اور وہ چاہے حدیثِ دلبری — مجھ سے مانگے رنگ و آبِ شاعری!
اس نے میرا سوزِ جاں دیکھا نہیں — صرف عیاں دیکھا، نہاں دیکھا نہیں
میری فطرت عشق سے ہم[2] بر ہوئی — ڈھونڈی صحبت آتش و خاشاک کی
فاش ہیں مجھ پر رموزِ ملک و دیں — دل سے دھویا غیر کا ہر نقشِ کیں
گل کو بخشے رنگ یہ مضموں مرا — میرا مصرع، ایک قطرہ خوں مرا
شاعری کو مت سمجھ دیوانگی — یہ جنوں ہے اوج میں فرزانگی
ہوں ہنر سے گرچہ میں سرمایہ دار — پر دیارِ ہند میں ہوں خوار و زار
گل نواؤں سے ہیں میری بے نصیب — اپنے ہی گلشن میں ہوں طائر غریب

یہ فلک سفلہ بھی، دوں پرور بھی ہے
آہ! وہ جو صاحبِ جوہر بھی ہے

۱۔ کیخسرو کا تخت ۲ ہم آغوش

تو نے دیکھا اے شہِ کیواں جناب
آفتاب اپنا ہوا زیرِ حجاب

اہلِ بطحا دشت میں گم ہو چکے
سوزِ اِلّا اللہ کو بھی کھو چکے

اور مصری غرقۂ گردابِ نیل
بجھ چکے تورانیانِ زندہ پیل

آلِ عثماں پر ہے ضربِ روزگار
شرق و غرب ان کے لہو سے لالہ زار

عشق میں آئینِ سلمانیؓ نہیں
خاکِ ایراں ہے پہ ایرانی نہیں

سوز و سازِ زندگی سے ہے تہی
وہ پرانی آگ دل میں بجھ گئی

مسلمِ ہندی ہے بندہ پیٹ کا
خود فروش اور دل سے دیں کو دھو چکا

اس میں اب وہ شانِ محبوبی نہیں
خالدیؓ، فاروقیؓ، ایوبیؒ نہیں

تجھ کو فطرت نے دیا ہے قلبِ چاک!
دیں کے غم سے سینہ تیرا چاک چاک

تازہ کر آئینِ صدیقؓ و عمرؓ
مثلِ بادِ صبح صحرا سے گزر

قوم یہ پروردۂ کوہ و دمن
اس کی رگ میں خونِ شیراں موج زن

ہے قوی اور زیرک اور روشن جبیں
آنکھ بازوں کی طرح ہے تیز بیں

اس کی قسمت کا اسے ملتا نہیں
اس کا وہ تارہ ابھی چمکا نہیں

کوہساروں میں ہے وہ خلوت گزیں
جد و جہدِ زندگی دیکھی نہیں

محنتِ پیہم میں تیری جاں صبور
زندہ کر تہذیبِ افغانِ غیور

تاکہ صدیقانِ امت میں رہے
دین کا سرمایۂ قوت بنے

جہد ہے چھیننا کب استحقاق ہے — صرف علمِ انفس و آفاق ہے
حق نے حکمت کو کہا "خیرِ کثیر" — جس جگہ تو خیر یہ دیکھے بگیر[1]
سیّدِ کلؐ، صاحبِ اُمّ الکتاب — جن کے دل پر سارے پردے بے حجاب
گرچہ عینِ ذات وہ دیکھا کیے — "رب زدنی علماً" دہرایا کیے
علمِ اشیاء علّم الاسما بھی ہے — یہ عصا بھی ہے، یدِ بیضا بھی ہے
سارے مغرب میں اسی سے روشنی — چھاچھ سے بھی وہ بناتے ہیں دہی!
لذتِ احساس سے خالی ہے جان — خاکِ رہ کو ریزۂ الماس جان!
علم و دولت ملّتوں کا نظمِ کار — علم و دولت ملّتوں کا اعتبار
علم کو لے سینۂ احرار سے — اور دولت سینۂ کہسار سے
چیر کر دیکھے اگر یہ کائنات — ہے بھری دولت سے مثلِ سومنات

لعل ہیں تیرے بدخشاں میں بھرے
برقِ سینا تیرے کوہستاں میں ہے!

ہو حکومت گر تری محکم اساس — چاہیے دیدہ اسے مردم شناس
آہ! وہ آدم کہ ابلیسی کرے — آہ! وہ شیطاں کہ ادریسی کرے
رنگ نیرنگ اس کا، بود اس کی نبود — داغِ لالہ سا بھرا سینے میں دود[2]
پاک باز اور اس کے پانسے میں دغل[3] — ہے نفاق و مکر سے پُر ہر عمل
کر نظر! اے خسروِ صاحب نظر! — سنگ جو چمکے، نہیں ہوتا گہر
اس حکیمِ پاک زادِ روم نے — سرِّ مرگ و زندگی افشا کیے

"امتیں اگلی تبہ کیسے ہوئیں
عود کو جندل[4] سمجھتی رہ گئیں"

(روم)

١ اٹھالے ٢ دھنواں ٣ دھوکا ٤ ایک قسم کا پتھر

دین میں خدمت گری ہے سروری　　عدلِ فاروقیؓ و فقرِ حیدریؓ

گو بہت ہیں کار ہائے ملک و دیں　　ساتھ دل کے ہو کبھی خلوت گزیں

جو کمیں میں اپنی بیٹھے ، بالیقیں　　کوئی صید اس کا اڑا سکتا نہیں

شاہ بن کر ، صورتِ درویش جی ،　　چشمِ بیدار و خدا اندیش جی !

قائدِ ملت شہنشاہِ مرادؔ !　　تیغ اس کی برق و تندر خانہ زاد

شاہِ گردوں فر بھی تھا درویش بھی　　اردشیری سے بہم تھی بوذریؓ

گو زرہ میں غرق تھا وہ تابہ دوش　　دل تھا اس کے سینے میں موئینہ پوش

وہ مسلماں جو کہ میری کر گئے　　بادشاہی میں فقیری کر گئے

شانِ فقر ان کی امیری میں رہی　　جیسے سلمانؓ تھے مدائن میں کبھی

حکمراں تھے پر کوئی ساماں نہ تھا　　پاس کچھ جز تیغ اور قرآں نہ تھا

جس کا عشقِ مصطفیٰؐ ہو برگ و بر　　گوشہ، داماں میں اس کے بحر و بر

سوز صدیقؓ و علیؓ کو حق سے مانگ　　ذرہَ عشق نبیؐ کو حق سے مانگ

عشق سے قائم ہے ملت کی حیات　　عشق ہی ہے برگ و سازِ کائنات

آپؐ کے جلوے ہی سے ظاہر ہوا　　جوہرِ پوشیدہ ہست و بود کا

روح انھیںؐ کے عشق سے آرام پائے　　روز پر اس کے نہ آنے شام پائے

اٹھ کے لا گردش میں پھر وہ جامِ عشق
دے کہستاں کو وہی پیغامِ عشق

○

لالۂ طور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لالۂ طور

(۱)

یہ عالم ہے شہید ناز اُس کا
نیاز اِس کی تو فطرت میں ہے گویا
یہ سورج جو چمکتا ہے فلک پر
جبینِ صبح پر ہے داغِ سجدا

(۲)

ہے روشن دل مرا سوزِ دروں سے
جہاں بیں آنکھ میری اشکِ خوں سے
وہ رمزِ زندگی سے نابلد ہے
جو رشتہ عشق کا جوڑے جنوں سے

(۳)

چمن میں عشق لاتا ہے بہاریں
کھلائے گل دمن میں مثلِ پرویں
شعاعِ مہر اس کی چیرے قلزم
وہی مچھلی کو بخشے چشمِ رہ بیں

(۴)

عقابوں کو وہ خاطر میں نہ لائے
کبوتر کو وہ شاہیں سے لڑائے
رہے دل لاکھ اپنا بچ کے لیکن
کمیں سے عشق تیر اپنا چلائے

(۵)

رہینِ رنگ لالہ عشق ہے ہے
عجب اس کی بلا انگیزیاں ہیں
اگر اس خاکداں کو چاک کردیں
تو دیکھو! اس کی کیا خوں ریزیاں ہیں

(۶)

نہیں ملتی محبت ہر کسی کو
نہ سب کو سازگار آتی ہے یہ شئے!
کھلے لالہ لیے داغِ جگر تاب
دلِ لعل بدخشاں بے شرر ہے!

(۷)

پریشاں اس چمن میں مثلِ بو ہوں
نہ جانے کیوں خرابِ جستجو ہوں
برآئے آرزو یا بر نہ آئے
شہیدِ سوز و سازِ آرزو ہوں

(۸)

جہاں ہے مشتِ گِل ، دل اس کا حاصل
یہی اک قطرۂ خوں اس کی مشکل
دو بیں ہے یہ نگہ اپنی ، و گر نہ
جہاں ہر شخص کا بس اس کا ہے دل !

(۹)

کہا بلبل نے کل یہ منہ اندھیرے
نہالِ غم سدا یاں لہلہائے !
بڑھاپے کو تو پہنچے خارِ صحرا
جوانی ہی میں گل کیوں جاں سے جائے ؟

(۱۰)

جہاں اپنا کہ ہے نابود اس کی بود ساری
زیاں تو سود ہی کے ساتھ یاں پیدا ہوا ہے
پرانے کو نیا کردے ، کوئی طرح دگر رکھ
کہ دیر و زود سے اس کے دل اپنا بھر چکا ہے

(۱۱)

نوائے عشق کا ہے ساز آدم
کہ کھولے راز ہے خود راز آدم
جہاں کو وہ بنائے ، یہ سجائے
خدا کا جیسے ہے انباز[۱] آدم

---

۱ برابر کا ساتھی

(۱۲)

میں جویا ابتدا نے انتہا کا
ہوں خود راز اور جہانِ راز ڈھونڈوں
اٹھے روئے حقیقت سے جو پردہ
تو اس بوک[۲] و مگر ، کا راز پالوں

(۱۳)

دِلا ! نارائیِ[۳] پروانہ کب تک
گریز از شیوۂ مردانہ کب تک
کبھی خود آگ میں اپنی بھی جل جا !
طوافِ آتشِ بیگانہ کب تک

(۱۴)

اسی مٹی سے پیدا کر تن ایسا
ہو محکم تر فضائے تنگ سے جو
دلِ درد آشنا ایسا ہو اس میں
کسی کہسار میں جیسے ندی ہو !

(۱۵)

خدا نے آب و گل سے ایک خوش پیکر بنایا
جہاں باغِ ارم سے اور زیبا تر بنایا
مگر ساقی نے پھر اس آتشِ سوزاں سے اپنی
ہماری خاک سے اک عالمِ دیگر بنایا

---

۲ بوک و مگر: شاید ایسا تھا ۔ ۳ ناآراستگی

(۱۶)

برہمن نے کہا محشر میں حق سے
کہ جینا تو فقط رقصِ شرر تھا
برا گر تو نہ مانے تو کہوں گا
صنم انساں سے بھی پائندہ تر تھا

(۱۷)

ہے کتنا تیز گام اے اخترِ صبح!
ہماری نیند سے شاید ہے بیزار
ہوں میں گم کردہ رہ نا آگہی سے
تو بیدار آیا ہے جاتا ہے بیدار

(۱۸)

تہی مئے خانہ ہوتا ہائے وہو سے
شرر بیگانہ رہتی رگِ گل ہماری
نہ ہوتا عشق اور ہنگامۂ عشق
خرد سا ہوتا فرزانہ جو دل بھی

(۱۹)

بنایا ہے تجھے اے تازہ پرواز
سراپا لذتِ بال آزمائی
ہوس نے دی گراں پرواز ہم کو
تجھے حاصل ہے ذوقِ پرکشائی

(۲۰)

خداوند! یہ لذت کیسی ہست و بود میں ہے
ہر اک ذرے کے دل میں ہے بپا جوشِ نمود اک!
کرے جب شاخِ گل کو چاک کوئی غنچۂ گل
تبسم ریز کر ڈالے اسے ذوقِ نمود اک

(۲۱)

سنا میں نے کہ پروانہ یہ کہتا تھا عدم میں
کہ پل بھر زندگانی کی مجھے بھی تاب و تب دے
سحر کے وقت کردے میری خاکستر پریشاں
مگر تھوڑا سا سوز و ساز مجھ کو ایک شب دے

(۲۲)

مسلمانو! مرے دل میں ہے ایسا حرف روشن
چمک جس کی سبھی آزر نہادوں سے نہاں ہے!
مگر روشن ہوا ہے جان جبریل امیں سے
کہ اسرارِ ابراہیمی کا وہ سرِّ نہاں ہے!

(۲۳)

چلا پھر اس گلی میں، اے دل! اے دل!
مجھے یوں چھوڑ کر یکّا و تنہا
دمادم آرزوئیں ہی جگائے
کوئی کام اور اب تجھ کو نہیں کیا۔

(۲۴)

کمند اپنی ستاروں پر تو پھینکی
مثالِ دانہ خود پر بھی نظر کر
تو اے نادان! خود سے آشنا ہو!
درونِ خاک سے پیدا شجر کر!

(۲۵)

سحر دم شاخسارِ بوستاں میں
کہا کیا خوب مرغِ نغمہ خواں نے!
سرود و نالہ ہو آہ و فغاں ہو
اُگل دے جو بھی ہے سینے میں تیرے!

(۲۶)

ادھر آ! نکتۂ سر بستہ اک تجھ کو بتاؤں
اگر لینا ہے مجھ سے تجھ کو درسِ زندگانی
تہی ہے جاں سے تن تو موت ہے تیرا مقدر
اگر جاں ہے تو حاصل ہے حیاتِ جاودانی

(۲۷)

حدیثِ سوز تو ہے سربسر آزار گوش اس کی
نہ چھیڑ اے ہم نشیں! ہر گز نہ چھیڑ اب اس کا افسانہ
جو خود ہو سخت کوش اور جان شعلہ نوش ہو جس کی
وہی پروانہ ٹھہرے گا نظر میں میری پروانہ

(۲۸)

بنادے خود سے جو بیگانہ تجھ کو
نہیں رکھتا میں وہ آبِ طرب ناک
مرے بازار میں مت ڈھونڈ کچھ اور
مثالِ گل ہے بس اک سینۂ چاک!

(۲۹)

ملے گا کیا تجھے گلشن میں میرے
شہیدِ رنگ و بو گر تو نہیں ہے
رگِ گل میں ہے کیا؟ آمیں بتادوں
چمن یہ، سحرِ رنگ و بو نہیں ہے!

(۳۰)

خودی تعمیر کر پیکر میں اپنے
فزوں ہو اس جہانِ کیف و کم سے
خلیل اللہ سا معمارِ حرم بن
نکل کر ورطۂ بود و عدم سے

(۳۱)

چمن کے طائرانِ خوش نوا سے
میں ناواقف ہوں، تنہا گا رہا ہوں
تو نازک دل ہے، تو مجھ سے حذر کر
نوا سے میری ٹپ ٹپ ٹپکے ہے خوں

(۳۲)

عجب ہنگامہ ہے تیرے جہاں میں
کہ ہیں سب ایک ہی پیمانے سے مست
نگہ سے تو نگہ ملتی ہے سب کی
پہ دل سے دل نہ جاں سے جاں ہے ہم دست

(۳۳)

سکندر نے کہا کیا خوب یہ نکتہ خضر سے کل
کبھی تو بھی شریکِ سوز و سازِ بحر و بر ہو جا
بڑی مدت سے تو اس جنگ کو تکتا ہے ساحل سے
شریکِ جنگ ہو کر جان دے اور زندہ تر ہو جا

(۳۴)

سریرِ کیقباد ، اکلیل جم خاک
کلیسا و بتستان و حرم خاک
نہیں معلوم ہم ہیں کون گوہر
نگہ بر تر ہے گردوں سے ، تو ہم خاک

(۳۵)

تری مٹی میں گر رکھا گیا ہے
دلِ صد پارہ و خوں نابہ باراک !
تو سیکھ ابرِ بہاری سے بھی گریہ
ترے اشکوں سے پھوٹے لالہ زار اک !

(۳۶)

بناتی ہے دمادم نقشِ تازہ
تڑپ ہی اک روش ہے زندگی کی
اگر تصویر "کل" کی ہے ترا "آج"
تہی ہے زندگی سے خاک تیری!

(۳۷)

جو ذوقِ نغمہ لائے سوئے جلوت
قیامت ایک محفل میں اٹھادوں
جہاں ہوجائے گم پھر میرے دل میں
اگر دم بھر کو میں خلوت گزیں ہوں

(۳۸)

نہ پوچھو سینے میں دل چیز کیا ہے
خرد میں سوز پیدا ہوتو ہے دل!
تپش ہی دل کو دل گردانتی ہے
تپش کو ہاتھ سے چھوڑے تو ہے گِل

(۳۹)

خرد بولی: سما سکتا نہیں ہے وہ نگاہوں میں
نگاہِ شوق امید و بیم ہی میں ہے ہمیشہ سے
پرانا ہو نہیں سکتا کبھی یہ طور کا قصہ
کہ ہر دل میں تمنائے کلیمی خیمہ کرتی ہے

(۴۰)

کنشت و مسجد و بت خانہ و دیر
کیا پیدا یہی انبارِ گِل کا !
یہاں اگتا ہے سب کچھ حکمِ دل سے
کیا غافل ! نہ تو نے دل ہی پیدا !

(۴۱)

لگایا دل نہ اس بستاں سرا سے
کہ میں آزاد ہر اک بند سے تھا
پھرا مثلِ نسیمِ صبح ہر سو
گلوں کو دے کے آب و رنگ گزرا !

(۴۲)

ملا دیتی ہے اپنے آپ سے رندِ کہن کو
جواں یہ مے جو میں ساغر میں بھرتا جا رہا ہوں
کہ میں یہ مئے انھیں پیران مے خانہ کے مانند
نگاہِ مست ساقی ہی سے لے کر آ رہا ہوں

(۴۳)

مرے جام سفالیں کو مئے اس کی جام جم کر دے
مرے قطرے میں اس نے اک سمندر ہی چھپا ڈالا
بنایا تھا خرد نے میرے سر میں ایک بت خانہ
خلیلِ عشق نے لیکن حرم اس میں بنا ڈالا

(۴۴)

ہاں یہ خرد تو پیروِ امروز و دوش ہے
سجدہ گزارِ ہر صنمِ چشم و گوش ہے
ہیں اس کی آستین میں بت ہی چھپے ہوئے
اولادِ برہمن ہے یہ زنّار پوش ہے

(۴۵)

خرد تو خیر ہر اک شخص کو بخشی گئی ہے
مرا یہ تن بھی اوروں کی طرح سے خاک و خوں ہے
مگر اس راز سے شاید اکیلا میں ہی واقف ہوں
ضمیرِ خاک و خوں میرا جو ہے وہ بے چگوں ہے

(۴۶)

گدائے جلوہ پہنچا برسرِ طور
ہنیں ہے جان تیری خود سے محرم
نکل جا جستجو میں آدمی کی
خدا خود ہے یہاں جویائے آدم !

(۴۷)

سنا ! جبریل کو میرا یہ پیغام
کہ ہم نے پیکر نوری نہ پایا
مگر ہم خاکیوں کی تاب و تب دیکھ
کہ نوری ، ذوق مجبوری نہ پایا

(۴۸)

ہمائے علم پھنس جائے گا تیرے جال کے اندر
یقیں رکھتا ہے تو کم کر۔ اسیرِ بیم و شک ہو جا
عمل کا ہے اگر خواہاں تو پختہ کر یقیں اپنا
تجسس ایک کا کر اور یک بیں بن کے یک ہو جا

(۴۹)

خرد نے تیرے چہرے کو حجابوں میں چھپا ڈالا
و لیکن تشنۂ دیدار رکھتا ہوں نظر میں بھی!
الجھتا رہتا ہے اندیشہ بڑھ کر شوق سے اکثر
ہے آشوب افگنی کیسی یہ جان زار میں میری!

(۵۰)

اجل کے خوف سے لرزے ترا دل
ہوا ہے زرد مانند زریری[۲]
خودی کو پختہ تر کر پختہ تر تھام
مرے گا پھر نہ بعد مرگ تو بھی!

(۵۱)

نہ پوچھ اس جان و تن سے میرا رشتہ
کہ میں اس دام میں ہرگز نہ آؤں
نوا جس طرح نکلے بانسری سے
دم آشفتہ ہوں اور مضطرب ہوں!

---

۲ ایک قسم کی زرد رنگ کی گھاس

(۵۲)

کہا مجھ سے یہ پیرِ نکتہ داں نے
ترے امروز کو فردا صدا دے!
بچا خوبانِ بے پروا سے دل کو
حریم اس کا ہے کر اس کے حوالے

(۵۳)

ضمیر اپنا دلیل اس کی ہر اک آیت پہ نکلے گا
میاں! رازی سے قرآں کے معانی پوچھتا کیا ہے
خرد تو آگ بھڑکاتی ہے اور دل خود ہی سوزاں ہے
بھلا تفسیرِ نمرود و خلیلؑ اس کے سوا کیا ہے!

(۵۴)

کہوں میں کیا کہ بہتر ہے خموشی
کہوں "میں ہوں" تو ٹھہرے خود پرستی
و لیکن یہ نوائے سادہ کیا ہے؟
"میں ہوں" سینے میں یہ کہتا ہے کوئی!

(۵۵)

سنا دو شاعرِ رنگیں بیاں کو میرا یہ پیغام
اگر یوں مثلِ لالہ تو جلے تو فائدہ کیا ہے
نہ اپنی آگ سے تو نے کبھی خود کو ہی پگھلایا
نہ شامِ درد منداں تجھ کو چمکانا ہی آیا ہے

(۵۶)

میں زشت و خوب سے تیرے نہیں ہوں آشنا اصلا
بنایا تو نے اس سود و زیاں ہی کو عیار اپنا
نہیں ہے مجھ سے تنہا تر کوئی اس بزمِ عالم میں
کہ میں نے دوسرے کی آنکھ سے دیکھی ہے یہ دنیا

(۵۷)

تو اے شیخ حرم! شاید نہیں اس بات سے واقف
جہانِ عشق کا بھی تو مقرر ایک محشر ہے
نہیں جس میں گناہ و نامہ ہی کوئی نہ ہے میزاں
نہ مسلم ہی کوئی اس میں نہ اس میں کوئی کافر ہے!

(۵۸)

جو خود سے تاب و تب لے قطرۂ آب
تو سو گوہر میں وہ یک دانہ ٹھہرے
تو اپنے ہم نواؤں میں جی ایسے
کہ گلشن تجھ کو خلوت خانہ ٹھہرے

(۵۹)

میں اے دانش ورو! ہر لحظہ پیچ و تاب میں گم ہوں
خرد پر کھل نہیں پایا کہ آخر ہے یہ قصہ کیا
نشیمن کس طرح اس خاک کے گھر میں کیا دل نے
یہ دل جو دشت ہے پیکِ غزالانِ خیالی کا!

(۶۰)

کنارے پر سجا محفل نہ اپنی، دیکھ یہ بھی
کنارے پر سبک رو ہے نوائے زندگانی
اتر جا سینۂ دریا میں، موجوں سے الجھ جا
ستیزہ کوشیوں میں ہے حیاتِ جاودانی

(۶۱)

سراپا معنیِ سربستہ ہوں میں
مجھے کیا حرف بافوں سے ہے لینا
مجھے مختار ہی کہیے نہ مجبور
سراپا انقلاب و خاکِ زندہ!

(۶۲)

نہ سمجھا مجھ کو، تو نے جو بھی سمجھا مدعائے زندگانی
کہ تیری شیوہ ہائے زندگانی پر نظر یکسر نہیں ہے
مجھے ذوق سفر ہے اور میں ذوقِ سفر سے مست ہوں اتنا
کہ منزل میرے نزدیک ایک سنگِ راہ سے بڑھ کر نہیں ہے

(۶۳)

نظر پڑ جائے گر تیری کسی اک سنگ ریزے پر
تری ہی آرزو کے فیض سے پھر وہ گہر ٹھہرے
نہ ناپ اے بندۂ زر خود کو تو پیمانۂ زر سے
کہ زر بھی تیرے اندازِ نظر کی چھب سے زر ٹھہرے

(۶۴)

نظر مضطر تھی ذوقِ جستجو سے
وفا ناآشنا ، بیگانہ خو تھا
تجھے دیکھا کہ سینے سے اڑا دل
نہ جانا ، اس کا دست آموز تو تھا !

(۶۵)

ہے کیا عشق ؟ اور کیا نیرنگیِ عشق ؟
وہ ہر اک رنگ میں جلوہ دکھائے !
ہنیں سینے میں اک نقطے سے بڑھ کر
ہے بے پایاں ، کبھی جو لب پہ آئے

(۶۶)

نہ ہو اے غنچۂ نورستہ دل گیر
میسر ہے چمن میں تو جو چاہے
لبِ جو ، بزمِ گل ، مرغِ چمن سیر
صبا ، شبنم ، نسیمِ صبح گاہے !

(۶۷)

گُلِ افسردہ مجھ سے کہہ رہا تھا
نمود اپنی تو پروازِ شرر تھی
بڑا ناپائیدار اس کا ہے ہر نقش
دکھی ہے میرا دل ، محنت پر اس کی

(۶۸)

جہاں اپنا نہیں ہے جس کا پایاں
ہے ماہی سا ، یمِ ایّام میں غرق
ذرا دل پر نظر کرتا کہ دیکھے
یمِ ایّام ہے اک جام میں غرق

(۶۹)

چمن زادوں کا میں ہم داستاں ہوں
زبانِ غنچہ ہائے بے زباں ہوں
مروں میں جب ، صبا کے ساتھ اڑا دو
کہ میں شیدائیِ طوفِ گلاں ہوں

(۷۰)

نظر آتا تو ہوگا ، جو بھی ہے یہ وادیِ گل
درونِ لالۂ آتش بجاں کیا ماجرا ہے ؟
چمن تو ایک موج رنگ ہے اپنی نظر میں
نہیں معلوم بلبل کی نگاہوں میں یہ کیا ہے ؟

(۷۱)

توُ سورج اور میں سیّارہ تیرا
کہ دمکادے مجھے نظّارہ تیرا
میں تجھ سے دور ! سو ہوں نامکمل !
توُ قرآں اور میں سیپارہ تیرا

(۷۲)

گزر اس کی درونِ دیدہ اچھی
فزوں غم اس کا ، جاں کا ہیدہ اچھی
یہ نکتہ ایک صاحب دل نے کھولا
کہ منزل سے رہِ پیچیدہ اچھی !

(۷۳)

میرا دماغ کافر زنّار دار ہے
بندہ بتانِ بندۂ پروردگار کا !
گریاں ہے میرا دل تو سدا درد عشق سے
آئین و دیں سے میرے سروکار تجھ کو کیا ؟

(۷۴)

صنوبر بندۂ آزاد اس کا
فروغِ روئے گل ہے اس کی مئے سے
حریم اس کے ہیں مہر و ماہ و انجم
دلِ آدم اسی کا بند در ہے

(۷۵)

جہاں کتنے تھے انجم تا بہ انجم !
خرد پر کھولتی تھی ۔ آسماں تھا
مگر جب آپ پر میں نے نظر کی
کرانِ بے کراں مجھ میں نہاں تھا !

(۷۶)

نہ ڈال اے دوست! اپنے پانو میں زنجیرِ تقدیر
کہ ہے اس گنبدِ گرداں کے نیچے راستہ بھی!
اگر باور نہ آئے تجھ کو تو اٹھ اور خود دیکھ
کہ جولاں گاہ ہے اک منتظر ہر گام تیری!

(۷۷)

مرا دل اپنے جادو کا گرفتار
جہاں یہ اس کے پرتو سے ہے پرضو!
مرے صبح و مسا کیا جانے سورج
مرے گزرے ہوئے پرسوں کا پرتو!

(۷۸)

یہ تیرا فیضِ زخمہ ہے، نوازن جس سے میرا سازِ جاں بھی ہے
پھر آخر کس طرح تو جاں میں بھی ہے اور جاں سے بھی ہے تو باہر؟
چراغ ایسا ہوں میں جلتا ہوں تیرے ساتھ، بن تیرے نہ جل پاؤں
مگر یہ تو بتا مجھ کو مرے بے چوں! کہ بن میرے ہے تو کیوں کر؟

(۷۹)

نفس یہ موجِ آشفتہ اسی کے بحر سے ہے
یہ میری نے، مرا نغمہ اسی کا فیضِ دم ہے
لبِ جوئے ابد پر مثلِ سبزہ میں اگا ہوں
رگ و ریشے میں میرے جو بھی نم ہے اس کا نم ہے

(۸۰)

تجھے یہ درد یکتائی ستاتا تھا
کیا پیدا جہانِ رنگ و بو تونے!
پہ ہے کیوں عشق سے میرے خفا اتنا
کہ کیوں پیدا کی اتنی ہائے و ہو تونے۔

(۸۱)

کسے تو ڈھونڈتا ہے، کس لیے آخر یہ پیچ و تاب میں گم ہے؟
کہ وہ تو صاف عیاں ہے اور تُو خود کو نقابوں ہی میں دیکھے گا
تلاش اس کی کرے گر تُو، تو جز اپنے کسی کو بھی نہ تُو دیکھے!
تلاش اپنی کرے گا تُو تو جز اس کے کسی کو بھی نہ پائے گا!

(۸۲)

تُو، اے کودک منش! اپنا ادب کر
مسلماں زادہ ہے، ترکِ نسب کر
عرب نازاں اگر ہے رنگ و خوں پر
تو اے مردِ خدا! ترکِ عرب کر

(۸۳)

نہ افغانی نہ ایرانی نہ ہم ہیں ترک و تاتاری
چمن زاد، ایک ہی شاخِ چمن سے ہیں وابستہ
تمیزِ رنگ و بو ممنوع ہے جائز نہیں ہم پر
کہ ہم تو ایک ہی فصلِ بہاراں کے ہیں پروردہ

(۸۴)

پنہاں ہے میرے سینے میں اک عالم
ہے دل اس خاک میں اور دل میں غم ہے
اُسی صہبا سے جس سے جاں ہے سوزاں
ابھی باقی سبو میں میرے نم ہے

(۸۵)

مرے دل! اے مرے دل! اے مرے دل!
مرے یم، میرے کشتی، میرے ساحل!
گرا مٹی پہ میری بن کے شبنم!
کہ خود غنچہ کھلاتی ہے مری گِل؟

(۸۶)

میں کیا بتلاؤں. تجھ کو نیک کیا ہے اور بد کیا؟
زباں بھی لڑکھڑاتی ہے کہ پیچیدہ ہے معنیٰ!
کھلے ہیں شاخ پر گل اور کانٹے بھی ہیں لیکن
درونِ شاخ دیکھو تو نہ کوئی گل نہ کانٹا!

(۸۷)

ہنیں ہے جس کو حاصل دردِ پنہاں
وہ تن رکھتا ہے، پر رکھتا ہنیں جاں
اگر جاں کی ہوس ہے تو طلب کر
وہ تاب و تب ہنیں ہے جس کا پایاں

(۸۸)

نہ پوچھو کون ہوں ، آیا کہاں سے؟
یہ خود پیچاں ہوں تو ہے زندگانی
کہ اس دریا میں مثلِ موجِ مضطر
یہ خود پیچاں نہ ہوں تو پھر ہوں فانی

(۸۹)

نہیں رکھتا نگاہِ شوق کی تاب
یہ صد جلوہ نقابوں میں چھپا ہے !
رواں ہے خوں میں مثلِ مستی مئے
مگر ہے دیر یاب اور کج ادا ہے !

(۹۰)

اٹھا منزل سے دل ، چل راہ اپنی
نگہ کو پاک مثلِ مہر و مہ رکھ !
متاعِ عقل و دیں اوروں کو دے دے
ملے گر عشق کا غم تو نگہ رکھ !

(۹۱)

اے میرے رمزِ دل ! اے عشق ادھر آ !
مری کھیتی ! مرے حاصل ادھر آ !
پرانے ہو چکے سب پیکرِ خاک
نیا آدم کوئی اب ڈھونڈ کر لا

(۹۲)

اگر دیتا ہے درد و غم سخن تو درد و غم اچھا !
مجھے لگتے ہیں میرے نالہ ہائے دمبدم خوشتر
سکندر کو خبر کیوں کر ہو میرے عیش و عشرت کی
کہ ملکِ جم سے اے ہمدم ! نوائے دلکشا بہتر !

(۹۳)

سوارِ مرکبِ ختلی[۵] نہیں میں
نہ میں وابستہ تخت و تاج سے ہوں
یہ دولت مجھ کو اے ہمدم بہت ہے
کہ سینہ کھود کر لعل اک نکالوں

(۹۴)

کمالِ زندگی چاہے تو پھر سیکھ
خود اپنے آپ پر ، وا آنکھ کرنا
بہالے جانا پانی کی طرح سب
طلسمِ زیر و بالا توڑ دینا

(۹۵)

کہے تو خاک کا پتلا ہے آدم
اسیرِ عالمِ زشت و زبوں تر
مگر اعجازِ فطرت نے رکھی ہے
بنائے بحر اسی کی آبجو پر - !

---

۵ بدخشاں کے ایک شہر ختلان کا گھوڑا

(۹۶)

دلِ بے باک ہے اک شیر گویا
دلِ ترساں کو آہو بھی ہے چیتا
ڈرے تو، تو مگرؔ ہر موج میں ہے
اگر بے خوف ہے تو بحر صحرا

(۹۷)

نہ جانے بادہ ہوں میں یا کہ ساغر
گہر دامن میں ہیں یا خود ہوں گوہر
یہی دیکھوں نظر ڈالوں جو دل پر
کہ میری جاں ہے دیگر ، میں ہوں دیگر

(۹۸)

تو کہتا ہے کہ زیرِ دام ہے طائر ہمارا
پروبال اس کے اڑنا بھول بیٹھے ہیں سراسر
بدن سے بھی سوا برجستہ تر ہیں جاں کے معنی
نیام اپنی حقیقت میں ہے گویا سانؔ خنجر

(۹۹)

ہمارے دل میں کیسے جنم لیتی ہے تمنا
چراغِ منزل اپنا کس طرح یہ جل رہا ہے
ہماری آنکھ کیسے دیکھتی ، کیا دیکھتی ہے
ہماری گِل میں کیسے دل چھپا بیٹھا ہوا ہے

---

۶ مگرمچھ کا مخفف ۷ فساں کا مخفف

(۱۰۰)

خراماں بعدِ مردن باغِ جنت میں ہوا جب
لیے تھے یہ زمین و آسماں آنکھوں میں میری
عجب اک شک کا عالم مجھ پہ طاری تھا وہاں پر
خداوندا جہاں تھا وہ کہ تصویرِ جہاں تھی !

(۱۰۱)

جہاں اپنا کہ جز ! نگارہ کیا ہے
کبھی ہے آج تو ہے یہ کبھی کل !
کرے ہموار اسے سوہاں قضا کا
کہ ہے یہ پیکرِ گِل نا مکمل !

(۱۰۲)

بھلا کس طرح تو اے آفتابِ آسماں گرد
در آتا ہے مری آنکھوں میں اتنی دور رہ کر
ہے واصل خاک سے اور خاک داں سے دور اتنا
تو اے مژگاں گسل ، تیرا نشیمن ہے کہاں پر ؟

(۱۰۳)

بنا تیشے سے اپنے راہ اپنی
سزا ہے دوسروں کی رہ پہ چلنا
ترے ہاتھوں سے ہو کر کارِ نادر
اگر ہو پاپ بھی تو پن بنے گا !

ریتی ، لوہے کا ایک اوزار

(۱۰۴)

ہے مطلب دل کو منزل سے
نہ آب و آتش و گِل سے
نہ بچھو تن میں سوتا ہے
نہیں کام اس کو ساحل سے

(۱۰۵)

نظر بازی کبھی تو شاہدِ فطرت سے کر ناداں
یونہی بیٹھا ہوا ہے گوشۂ خلوت میں کیوں آخر
خدائے لم یزل نے تجھ کو چشمِ پاک بیں دی ہے
اب اس کے نور سے اس کے لیے پیدا نظر بھی کر!

(۱۰۶)

اِس آب و گل میں میں خلوت گزیں ہوں
نہ افلاطوں نہ فارابی کو جانوں
کسی کی آنکھ کا جویا نہیں میں
خود اپنی آنکھ سے سب دیکھتا ہوں

(۱۰۷)

خبر کس کو ہے آغازِ خودی کی
خودی کو حلقۂ شام و سحر کیا
خضر سے نکتۂ نادر سنا یہ!
نہیں ہے موج سے دیرینہ دریا

(۱۰۸)

مرے دل سیکھ لے غنچے سے رمزِ زندگانی
حقیقت اس کے ظاہر میں نمایاں ہو رہی ہے
کہ خاکِ تیرہ سے باہر نکلتا ہے و لیکن
نظر اس کی شعاعِ آفتابی پر جمی ہے

(۱۰۹)

یہ بزمِ باغ وراغ اس کے ہی جلووں سے ہے روشن
یہ گلِ روشن ایاغ ، اس کی ہی مے سے ہو رہا ہے
نہ ہوگی شب کسی کی تیرہ و تار اس جہاں میں
کہ ہر دل میں اسی کے داغ کا دیپک جلا ہے

(۱۱۰)

چمن کی خاک سے اک غنچہ پھوٹا
پھر اس کی آنکھ سے نیند اوس نے دھوئی
خودی ظاہر ہوئی پھر بے خودی سے
جہاں پایا وہ جس کی جستجو تھی !

(۱۱۱)

جہاں کو تھی نہ خود پردست گہہ کوئی
تو کوئے آرزو میں راہ اک ڈھونڈھی
پھر آغوشِ عدم سے اک ذرا نکلا
نکل کر قلبِ آدم میں سپہ لے لی !

(۱۱۲)

مرا دل رازدانِ جسم و جاں ہے
نہ سمجھو موت کچھ مجھ پر گراں ہے
نظر سے اک جہاں کھویا تو کیا غم
ہنوز اس دل میں میرے صد جہاں ہے

(۱۱۳)

گلِ رعنا ہے مشکل میں مری طرح
گرفتارِ طلسم انجمن ہے
نہیں گویا زبانِ برگ اس کی
مگر سینے میں اک دل خیمہ زن ہے

(۱۱۴)

مزاجِ لالۂ خود رو سمجھتا ہوں
درونِ شاخ بو سے آشنا ہوں
تبھی مرغِ چمن ہے دوست میرا
کہ اس کے گیت کے سُر جانتا ہوں

(۱۱۵)

جہاں اک نغمہ زارِ آرزو ہے
بم و زیر اس کا تارِ آرزو سے
مری نظروں میں "تھا" "ہے" اور "ہوگا"
فقط ہے روزگارِ آرزو سے

(۱۱۶)

مرا دل بے قرارِ آرزو ہے
مرے سینے میں برپا ہائے و ہو ہے
سخن کیا چاہتا ہے مجھ سے ہمدم!
کہ میری خود مجھی سے گفتگو ہے!

(۱۱۷)

ہے سوز ناتمامی میں دوام اپنا
تڑپنا مثلِ ماہی صرف کام اپنا
کنارے سے حذر! یعنی کنارے پر
بچھا کر موت واں بیٹھی ہے دام اپنا

(۱۱۸)

برہمن سے خفا اتنا نہ ہو اے واعظِ شہر
بتوں کے سامنے ہم سے اگر وہ سجدہ چاہے
خدا نے بھی ہمارے کی تھی خود صورت گری اک
کہا تھا سجدہ کرنے کو اسے پھر قدسیوں سے!

(۱۱۹)

حکیموں نے اگرچہ توڑ ڈالے کتنے پیکر
مگر ہے سومناتِ ہست و بود ان کا مقدر
کریں گے کس طرح افرشتہ و یزداں کو بس میں
ابھی فتراک میں ان کے نہیں آدم برابر!

(۱۲۰)

جہاں اُگتے ہیں میری مشتِ گل سے
مرے حاصل سے لے سرمایہ اپنا
غلط سر کی ہے راہِ منزل دوست
مرے صحرائے دل میں ایک پل آ!

(۱۲۱)

ہزاروں سال تھا ہمدوشِ فطرت
ہوا اس کا ، کیا خود سے کنارا !
و لیکن سرگزشت اتنی ہے میری
تراشا ، کی پرستش ، توڑ ڈالا !

(۱۲۲)

میں پہنائے ازل میں پرکشا تھا
کہ بیگانہ تھا بندِ آب و گل سے !
بہا میری ہے اونچی تیرے نزدیک
کہ اس بازار میں تو مجھ کو لائے !

(۱۲۳)

نہاں اک جلوۂ افکار ، یہ کیا !
عیاں اک عالمِ اسرار ، یہ کیا !
بتا تو ہی حکیمِ نکتہ پرداز
بدن آسودہ ، جاں سیّار ، یہ کیا !

(۱۲۴)

مجھے بھی ناز ہے خود پر کہ میں بھی ہوں گدائے بے نیاز اک
تپاں ہوں اور فیض نے نوازی سے جلوں میں اور پگھلوں
بٹھا دیتا ہوں اپنے سوزِ نغمہ سے میں انگاروں میں. تجھ کو
مری فطرت سکندر کی ہے، میں آئینہ سازی میں لگا ہوں

(۱۲۵)

اگر تو ہوگیا آگاہ اپنے کیف سے، کم سے
تو پھر تعمیر کر تو بحر اپنا اپنی شبنم سے
مرے دل، آہ! یہ دریوزگی مہتاب کی کب تک
تو اپنی رات کو چمکا تو چمکا اپنے ہی دم سے!

(۱۲۶)

نہ کرتو غم کہ دل کی زندگی دم سے نہیں ہے
اسیرِ حلقہ بودوعدم بھی دل کہیں ہے
نہ ڈرا اے کم نظر! پیکِ اجل سے تو کبھی بھی
گیا گردم، رہا باقی یہ دل. تو غم نہیں ہے

(۱۲۷)

یہ دل ہے میرے پہلو میں، تو بہتر
ہے تشریفِ شہاں سے میری گدڑی!
رہے گا بعدِ مردن بھی مرے ساتھ
مجھے اس دل سے امیدیں ہیں کتنی!

(۱۲۸)

سنا دو صوفیانِ باصفا کو
خدا جویانِ معنیٰ آشنا کو
غلامِ ہمت اس کاہوں میں جس نے
خودی کے نور سے دیکھا خدا کو

(۱۲۹)

گزر مت اس چمن سے مثلِ نرگس یعنی بن دیکھے
مثالِ بو گزر مت غنچۂ پیچیدہ سے ہوکر
تجھے حق نے دیا ہے دیکھ تو اک دیدہ روشن تر
فرد بیدار ہو، خوابیدہ دل ہو، یوں گزر مت کر

(۱۳۰)

تراشے ہیں صنم اپنی ہی صورت پر
بنایا ہے خدا کا نقش بھی خودسا
ہے ناممکن نکلنا آپ سے باہر
بہ ہر صورت خود اپنے آپ کو پوجا!

(۱۳۱)

کہا اک غنچۂ نورستہ نے اک روز شبنم سے
کہ ہم اہل چمن کی تو نظر ہی نارسا سی ہے
ذرا یہ تو بتا مجھ کو، جہاں ہیں سینکڑوں سورج
انھیں پہنائیوں میں پست و بالا کا نشاں بھی ہے؟

(۱۳۲)

زمیں کو آسماں کا رازداں جان
مکاں کیا ، شرحِ رمزِ لا مکاں ہے
اڑے ہر ذرہ سوئے منزلِ دوست
نشانِ راہ لے ریگ رواں سے

(۱۳۳)

ضمیرِ کن فکاں کچھ ہے تو توٗ ہے !
نشانِ بے نشاں کچھ ہے تو توٗ ہے !
قدم بے باک تر رکھ زندگی میں
بہ پہنائے جہاں کچھ ہے تو توٗ ہے !

(۱۳۴)

ہمارے میکدے کی خاک ہے ورنہ زمیں کیا ہے
ہمارے ایک پیمانے کی گردش ہے فلک گویا !
ہے طولانی ہماری یہ حدیثِ سوز و ساز اے دوست!
جہاں یہ ہے فسانے کا ہمارے ایک دیباچہ !

(۱۳۵)

سکندر چل دیا ساتھ اس کے شمشیر و علم رخصت
خراجِ شہر رخصت اور گنجِ کان و بم رخصت
امم کو پادشاہوں سے سوا پائندہ تر جانو
کہ ایراں رہ گیا باقی ہوئے کاؤس و جم رخصت

(۱۳۶)

اڑایا دل کو سینہ چاک کر کے
کیا غارت مرا گنجینہ سارا
متاعِ آرزو میری کسے دی ؟
غمِ دیرینہ کا میرے کِیا کیا ؟

(۱۳۷)

نگاہوں سے جہانِ رنگ و بو گم
زمین و آسمان و چار سو گم
تری خلوت سے وہ رخصت ہوئے ہیں
کہ خود اے دل ہوا ہے ان سے تُو گم !

(۱۳۸)

نہیں واقف کہ کیا ہے پردۂ ساز
پہ واقف ہوں نوائے زندگی سے
ہوا یوں شاخساروں میں نواخواں
کہ "ہے یہ کون ؟" گل بلبل سے پوچھے !

(۱۳۹)

سرِ محفل ہوا نغمہ سرا میں
شرارِ زندگی مٹی میں ڈالا !
ہوا نورِ خرد سے دل ضیا گیر
خرد کو پھر عیارِ دل پہ رکھا !

(۱۴۰)

عجم ہوا ہے جواں میرے گیت سن سن کر
متاع اس کی گراں ہے، وہ ہے مرا سودا
بھٹکتا دشت میں گم کردہ رہ ہجوم تھا اک
مری درا سے وہی بن کے کارواں نکلا

(۱۴۱)

مری نَے سے عجم آتش بہ جاں ہے
صدا میری درائے کارواں ہے
حدی خواں تیز تر ہوں مثلِ عرفیؔ
کہ رہ خوابیدہ اور محمل گراں ہے

(۱۴۲)

جو مجھ میں تھی وہ آتش میں نے بھڑکا دی
اٹھا کر سینۂ مشرق میں دل رکھا
بنی ہے اس کی مٹی شعلہ زار آخر
کہ میں اس پر ہوں بجلی کی طرح ٹوٹا!

(۱۴۳)

مجھے مثلِ نسیم آوارہ کر ڈالا
مرا دل مثلِ گُل صد پارہ کر ڈالا
نگہ کو میری جو ظاہر ہنیں دیکھے
شہیدِ لذتِ نظّارہ کر ڈالا

(۱۴۴)

خرد کرپاس کو چاہے تو زرّسینہ بناڈالے
کمال اس کا تو پتھر کو بھی آئینہ بناڈالے
نوائے شاعر جادو بیاں میں ہے اثر ایسا
کہ نیشِ زندگانی کو وہ نوشینہ بناڈالے

(۱۴۵)

چکھا پھل میں نے شاخِ آرزو کا
کہ رازِ زندگی میں جانتا ہوں
ذرا ڈر باغباں سے ناوک انداز
کہ پیغامِ بہاراں لارہا ہوں

(۱۴۶)

تخیل میرا جو چنتا ہے گل، گلزارِ جنت کے
اسے جس وقت مضمونِ غریب اک سوجھ جاتا ہے
لرزتا ہے مرا دل سینے میں اس برگِ گل کی طرح
کہ جس پر قطرۂ شبنم کبھی اک بیٹھ پاتا ہے

(۱۴۷)

عجم ہے بحرِ ناپیدا کرانہ
ہے اس میں گوہرِ الماس رنگ اک!
مجھے کھینا نہیں ہے اس میں کشتی
نہیں ہے اس کے دریا میں نہنگ اک!

---

۹ روئی ۱۰ سونے کا کام کیا ہوا کپڑا

(۱۴۸)

چھٹا بھی تو، خداوند ان افرنگی کے چنگل سے
تو جاجاکر بہ ہرجا گوروگنبد کو کیئے سجدے
غلامی نے کیا ایسا نشیمن تیری فطرت میں
کہ سنگِ راہ سے اپنے لیے آقا بناڈالے

(۱۴۹)

نہ کہہ کارِجہاں میں استواری ہی نہیں ہے
کہ جو لمحہ ہمارا ہے۔ ہے پردہ دار ابد کا!
پکڑلے دامنِ امروز کو محکم کہ فردا
ضمیرِ روزگاراں میں ابھی ہے چھپ کے بیٹھا!

(۱۵۰)

ہائے زندگانی چاک کب تک
ارے تیرا نشیمن خاک کب تک
ذرا پَر کھول! شاہینی بھی کچھ سیکھ
تلاشِ دانہ در خاشاک کب تک

(۱۵۱)

نشیمن لالہ و گل میں کبھی اپنا بنا
ذرا درسِ فغاں بھی سیکھ مرغِ نغمہ خواں سے
اگر تو پیر ہوتا جارہا ہے تو جوانی
تو حاصل کر جہاں کے اس شبابِ جاوداں سے

(۱۵۲)

قسم ہے مجھ کو جاں کی جس نے نقشِ تن بنایا ہے
ہوائے جلوہ نے اس گل کو آخر کر دیا دو رو[11]
ارے یہ جانِ مضطر تو ہزاروں شیوے رکھتی ہے
بدن ہو جاتی ہے جب ایک ہی شیوے سے کر لے خو

(۱۵۳)

سنی اک قبر سے میں نے یہ آواز
کہ زیرِ خاک بھی ممکن ہے جینا
وہ مردہ ہے، اگرچہ لیتا ہے سانس
جو شخص اوروں کی مرضی پر ہے زندا

(۱۵۴)

نہ ہو مایوس ہرگز دیکھ کر مشت غبار اس کا
پریشاں جلوہ ہے جو، اور نہ عالم پائیدار اس کا
مگر فطرت کبھی بھی ڈھالتی ہے جب کوئی پیکر
تو کرتا ہے تمام اک روز اس کو روزگار اس کا!

(۱۵۵)

جہانِ رنگ و بو فہمیدنی ہے
ہر اک گل اس چمن کا چیدنی ہے
کبھی اپنے دُروں پر بھی نظر کر
کہ یہ عالم بھی ناداں دیدنی ہے

11- ایک قسم کا دو رنگی پھول جو اندر سے سرخ اور باہر سے زرد ہوتا ہے۔

(۱۵۶)

کہا تو نے جہاں بے انت ہے اور تو ہے موجود
خدا کہتے ہیں جس کو وہ کہیں اصلا ہنیں ہے
مگر مجھ پر ابھی یہ راز ہی کھلنے نہ پایا
نظر کے سامنے جو ہے وہ ہے بھی یا ہنیں ہے!

(۱۵۷)

نہ میرے خوان پر مرغِ کباب اور
نہ میرے جام میں مئے آئینہ ناب!
ہرن گو گھاس ہی کھاتا ہے میرا
مگر ہے خونِ دل میں مشک نایاب!

(۱۵۸)

رگِ مسلم تپاں ہے میرے ہی سوز جگر سے
مرے آنسو بہے جاتے ہیں اس کی چشم تر سے
وہ تیرے محشرِ جاں سے ابھی تک بے خبر ہے
جہاں کو اس نے دیکھا ہی ہنیں میری نظر سے

(۱۵۹)

بیاں میں آ ہنیں سکتا کہ آخر لامکاں کیا ہے
ذرا دیکھ اپنے اندر، خود بہ خود کھل جائے گا نکتہ
بدن میں اس طرح اپنا بنایا آشیاں جاں نے
کہ کہہ سکتے ہنیں ہم، جاں وہاں ہے یاں ہنیں پیدا

(۱۶۰)

ہر اک دل میں جمایا عشق نے بھی رنگ اک تازہ
کبھی پتھر سے ٹکرلی کبھی شیشے سے سر توڑا
تجھے خود سے کیا بیگانہ اور اک چشم تر دے دی
پر اپنے آپ سے نزدیک اس نے مجھ کو کر ڈالا!

(۱۶۱)

ابھی اس بندِ آب و گل سے تو چھُٹنے نہیں پایا
کہ خود کو کہہ رہا ہے تو جویوں رومی و افغانی
ولیکن سب سے پہلے آدم بے رنگ و بوہوں میں
پھر اس کے بعد کہلاؤں گا ہندی اور تورانی

(۱۶۲)

غبارِ راہ کو میری کیا مشت شرر اس نے
مرے ذوقِ سخن نے توجگر خوں کردیا میرا
زباں کھولی تھی گفتار محبت میں ذرا میں نے
بیاں نے اور بھی اس راز کو پیچیدہ کرڈالا!

(۱۶۳)

کیا خوں عشق کے ہاتھوں دلِ خود کام کو اس نے
گریزاں ہوگیا آخر کو عقل ذوفنوں سے اب
تم اقبالِ فلک پیما کا قصہ پوچھتے کیا ہو!
حکیمِ نکتہ داں یہ کام لیتا ہے جنوں سے اب

افکار

پہلا پھول

چمن میں ہم نفَس اپنا نظر نہیں آتا
بہار آرہی ہے، مَیں گلِ نخستیں[۱] ہوں

ندی میں جھانک کے جب اپنا چہرہ دیکھوں میں
تو اس بہانے کسی اور ہی کا رخ بیں ہوں

اسی قلم سے ، خطِ زندگی لکھا جس سے
پیام اس کا ہے جس پر ، وہ برگِ رنگیں ہوں

ہے دوش دل میں تو آنکھوں میں عبرتِ امروز
شہیدِ جلوۂ فردا و تازہ آئیں ہوں

میں خاک تیرہ سے اٹھّا قبائے گل پہنی
وگرنہ میں تو اک اخترِ زِ اوج پرویں ہوں

۱- پہلا

دعا

اے کہ مرا فطرت کے خم خانے سے تو نے جام بھرا
آتشِ صہبا سے میری اب پگھلا دے میری مینا

گرمیِ فریاد یہ میری عشق کا سرمایہ بن جائے
شعلۂ بے باک اک دن بن جائے میری خاکِ سینا

میں مرجاؤں تو میری مٹی سے بنا لالے کا چراغ
سوزاں کر میرے صحرا کو، تازہ کردے میرا داغ

○

ہلالِ عید

تو اے ہلالِ عید! کہاں بچ کے جائیگا
ہم نے بچھا رکھے ہیں نظر کے ہزار دام

خود کو بھی دیکھ! رنجِ تہی دامنی نہ کر
سینے میں تیرے رکھا ہوا ہے مہِ تمام

تسخیرِ فطرت

(۱)

میلادِ آدم

عشق لکارا کہ اک خونیں جگر پیدا ہوا
حسن کانپ اٹھا کہ اک صاحب نظر پیدا ہوا

چونک اٹھی فطرت کہ اس خاکسترِ مجبور سے
ایک خودگر ، خودشکن اور خودنگر پیدا ہوا

یہ شبستانِ ازل میں پہونچی گردوں سے خبر
ہوشیار ! اے پردہ دارو ! پردہ در پیدا ہوا

آرزو نے ، بے خبر تھی جو بہ آغوشِ حیات
آنکھ کیا کھولی کہ اک عالم دگر پیدا ہوا

زندگی بولی کے مٹی میں تپی ہوں ایک عمر
تب کہیں اس گنبدِ بے در میں در پیدا ہوا

(۲)

انکارِ ابلیس

نوریِ ناداں نہیں، خاک کو سجدہ کروں
خاک کا پتلا ہے وہ اور میں آتش سے ہوں

سوز سے میرے تپاں خونِ رگِ کائنات
میں دوِ[1] صرصر کے ساتھ میں غوِ[2] تندر میں ہوں

رابطۂ سالمات ، ضابطۂ امّہات
سوز میں اس میں بھروں ۔ ساز اسے اپنا دوں

تیرا بنایا ہوا ٹوٹے مری ضرب سے
اور اسی خاک سے پیکرِ نو ڈھال لوں

نقش گرِ روزگار ، گرمیِ جوہر مری
موجۂ دریا مری چرخ کا توڑے سکوں

پیکرِ انجم ترا ، گردشِ انجم مری
جان جہاں کی ہوں میں ، اس کی حیاتِ دروں

تجھ سے بدن میں ہے جان، جان میں مجھ سے ہے شور
تو بہ سکوں راہ زن ، میں بہ تپش رہ نموں !

میں کہ تنک مایوں سے سجدوں کی مانگوں نہ بھیک
قاہرِ بے دوزخ و داورِ بے حشر ہوں

آدمِ خاکی نہاد ، دوں نظر و کم سواد
جنم ترے پاس لے ، میں اسے بوڑھا کروں

صحرائی گرم ہوا کا طوفانی جھونکا ۲ بجلی کی کڑک

اغوائے آدم

زندگیِ سوز و ساز یا کہ سکونِ دوام ؟
فاختہ شاہیں بنے وہ ہے تپشِ زیرِ دام

غیرِ سجودِ نیاز کام نہیں اور کوئی ؟
سرو کے مانند اٹھ ! اے بہ عمل نرم گام

کوثر و تسنیم نے تجھ سے نشاطِ عمل
چھین لیا ؛ تاک سے پی مئے آئینہ فام

نیک ہو وہ یا کہ بد تیرے خدا کا ہے وہم
لذتِ کردار چکھ ! گام اٹھا ، سیکھ کام

اٹھ ! کہ دکھاؤں تجھے ایک نئی مملکت
چشمِ جہاں بیں تو کھول ، دیکھ تو لطفِ خرام

قطرہ تو بے مایہ ہے ، گوہرِ تابندہ بن
چھوڑ کے گردوں ٹپک ! اور ہو دریا مقام

تیغ درخشندہ ہے تو ، کبھی عالم پہ گر
تیغ کا جوہر دکھا چھوڑ کے قیدِ نیام

بازوئے شاہیں تو کھول ، خونِ تدرواں[1] تو پی
موت ہے یہ زندگی زیرِ سکونِ کنام[2]

تو نے نہ جانا ابھی وصل میں ہے مرگِ شوق
کیا ہے حیاتِ دوام ؟ سوختنِ ناتمام[3]

۱- تدرو - چکور ۔ ۲- کنام - نشیمن ۔ ۳- ادھ جلا ہونا

(۴)

آدم بہشت سے نکل کر نغمہ سرائی کرتا ہے

ہے عجب مزہ یہ خود کو ہمہ سوز و ساز کرنا
دلِ کوہ و دشت و دریا بہ نفس گداز کرنا

یہ قفس سے چھوٹ جانا، یہ چمن میں پھیل جانا
تو کبھی ستارگاں سے یہ نیاز و راز کرنا

کبھی باگدازِ پنہاں، کبھی بانیازِ پیدا
کبھی چاک چاک پردے بہ حریم ناز کرنا

سربزم گل نظر میں کبھی سب کچھ ایک آنا
کبھی خار اور گل میں مگر امتیاز کرنا

ہمہ سوز ناتمام و ہمہ دردِ آرزو ہوں
وہ یقیں ہو یا گماں ہو کہ شہیدِ جستجو ہوں

(۵)

صبحِ قیامت

(آدم باری تعالیٰ کے حضور میں)

اے ترے سورج سے ہے کوکبِ جاں مستنیر[1]
دل سے جلائی مرے شمعِ جہانِ ضریر[2]

میں نے کیا بحر کو بند بہ یک نائے[3] آب
ضرب سے میری رواں سینۂ خارہ سے شیر

زہرہ کو میری ہے چاہ ، میرا پرستار ماہ
میری کلاں کار عقل کرتی رہی داروگیر

زیرِ زمیں میں گیا ، اوجِ فلک پر اڑا
سحر میں میرے بندھے ذرّہ و مہرِ منیر

اس کے فسوں نے مجھے راہ سے بھٹکا دیا
میری خطا کر معاف ، عذرِ گنہ کر پذیر

جگ نہیں ہوتا ہے رام کھائیں نہ جب تک فریب
جذبہ کمندِ نیاز ہوتا نہیں ناز اسیر

یہ بتِ سنگیں کھُلا گرم مری آہ سے
باندھنا زنّار تھا میرے لئے ناگزیر

دام میں لاتی ہے عقل فطرتِ چالاک کو
اہرمنِ شعلہ زاد سجدہ کرے خاک کو

۱- روشن
۲- تاریک
۳- آبجو ، ندی

خوشبو

اک حور کنجِ گلشنِ جنت میں مضطرب
بولی - خبر فلک سے اُدھر کی، اِدھر نہ آئی

ہیں صبح و شام کیا؟ ہے شب و روز کس کا نام؟
یہ بات آج تک بھی سمجھ میں مری نہ آئی

کہتے ہیں کس کو زندگی؟ ہے موت چیز کیا؟
پیچیدہ سی یہ بات کبھی مجھ پہ کھل نہ پائی"

نکہت بنی پھر اور چلی سوئے شاخ گل
جنت سے نکلی، عالمِ دو روزہ میں در آئی

کھولی پھر آنکھ اور بھرا اک کلی کا روپ
پھر بن کے پھول شاخ پہ دھیرے سے مسکرائی

مرجھا کے برگ برگ ہوئی خاک پر گری
آغوش گل میں حیف کہ دو دن نہ لہلہائی

جنت سے بند توڑ کے نکلی تھی نازنیں
کھینچی اک اس نے آہ جو خوشبو کا نام لائی

نوائے وقت

خورشید بہ داماں ہوں ، انجم بہ گریباں ہوں
خود فہم ہوں تو ہوں ہیچ، خود بیں ہوں تو میں جاں ہوں

میں شہر و بیاباں میں ، میں کاخ و شبستاں میں
میں درد ہوں ، درماں ہوں ، میں عیشِ فراواں ہوں
میں تیغِ جہاں سوزاں ، میں چشمۂ حیواں ہوں

ہے میری کفِ خاک اک چنگیزی و تیموری
ہنگامۂ افرنگی ہے میری ہی چنگاری

انسان اور اس کی یہ دنیا مری نقاشی
خونِ جگرِ مرداں پھولوں کی ہے رت میری
میں آتش سوزاں ہوں ، میں روضۂ رضواں ہوں

سیّار بھی ثابت بھی کیا طرفہ تماشا ہوں
امروز کے ساغر میں کیفیتِ فردا ہوں

سینے میں چھپائے میں صد عالمِ رعنا ہوں
سَو کوکبِ غلطاں ہوں ، سَو گنبدِ خضرا ہوں
میں کسوت انساں ہوں ، پیراہنِ یزداں ہوں

تقدیر فسوں میرا ، تدبیر فسوں تیرا
لیلا پہ مری تو غش ، میں دشتِ جنوں تیرا

ان تیرے سوالوں سے ہوں پاک مثالِ روح
تو رازِ دروں میرا ، میں رازِ دروں تیرا
جاں سے تری پیدا ہوں ، جاں میں تری پنہاں ہوں

منزل ہے تو، میں راہی، میں کشت ہوں، تو حاصل
تو سازِ صد آہنگ اور تو گرمیِ ہر محفل

آوارۂ آب و گل! ڈھونڈ اپنا مقامِ دل
ساغر میں سمایا دیکھ! یہ قلزمِ بے ساحل
میں تیری ہی موجوں کا مچلا ہوا طوفاں ہوں

○

حیاتِ جاوید

گماں نہ کر کہ ہوا ختم اب یہ کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ شاخِ تاک میں ہے

چمن تو خوب ہے لیکن مثالِ غنچہ نہ جی
حیات جس کی قباہائے چاک چاک میں ہے

ہے رمزِ زیست اگر تجھ پہ فاش، تومت ڈھونڈ
وہ دل کہ جو خلشِ خارِ آرزو سے ہو پاک

سمٹ کے آپ میں مضبوط کوہ صورت، جی
نہ مثلِ خس، کہ ہوا تیز، شعلہ ہے بے باک

○

فصلِ بہار

(۱)

آگئی دشت وکوہ میں فصلِ بہارِ گل فشاں
طوطی و سار نغمہ خواں
مرغ ہزار داستاں
بہتی ہوئی یہ ندیاں
لالہ و گل ہیں ضوفشاں
کھول کے آنکھ دیکھ عیاں
آگئی دشت و کوہ میں فصلِ بہارِ گل فشاں

(۲)

اٹھ کہ وہ باغ وراغ میں پہونچی گلوں کی پالکی
بادِبہار چل پڑی
چھیڑیں طیور بانسری
چاک قبائے لالہ بھی
حسن چنے کلی کلی
عشق کی جان پر بنی
اٹھ کہ وہ باغ و راغ میں پہونچی گلوں کی پالکی

(۳)

نغمہ نواز بلبلیں ، مرغِ بہار پُر خروش
خونِ چمن ہے گرم جوش
بیٹھا ہوا ہے کیوں خموش
توڑ دے ہر فسونِ ہوش
کر مئے معنی بڑھ کے نوش
چھیڑ کے گیت، گل بہ پوش
نغمہ نواز بلبلیں ، مرغِ بہار پُر خروش

(۴)

چھوڑ کے حجرہ باہر آ! گوشۂ دشت ڈھونڈ کوئی
جوئے رواں پہ بیٹھ بھی
بہتی ہے دیکھ کیا ندی
نرگسِ ناز مد بھری
باصد ادائے دل بری
اس کی جبیں ہے چومتی
چھوڑ کے حجرہ باہر آ! گوشۂ دشت ڈھونڈ کوئی

(۵)

دیدۂ معنی اپنا کھول، تو ہے عیاں سے بے خبر
لالہ کھلا کمر کمر
آگ کا کرتہ جسم پر
شبنمِ اشک سے، سحر
اس کا جگر کرے ہے تر
تارہ شفق پہ جلوہ گر
دیدۂ معنی اپنا کھول، تو ہے عیاں سے بے خبر

(۶)

خاکِ چمن کرے ہے فاش، رازِ درونِ کائنات
بود و نبودِ کُل صفات
جلوہ نمائی ہائے ذات
کہتا ہے جس کو تو حیات
جس کا تو نام دے ممات
حاصل انھیں نہیں ثبات
خاکِ چمن کرے ہے فاش، رازِ درونِ کائنات

افکارِ انجم

(۱)

کہا تارے نے اک تارے سے اک دن　ہمارے بحر کا ساحل نہیں ہے
سفر لکھا ہے فطرت میں ہماری　مگر اس کی کوئی منزل نہیں ہے

(۲)

اگر تارے یہی ہیں جو کہ ہم ہیں　تو اس دیرینہ تابی سے ملا کیا
گرفتارِ کمندِ وقت ہیں ہم　خوشا جس نے وجود اپنا نہ پایا

(۳)

کسی سے بوجھ یہ بھاری نہ اٹھ پائے　یہ بود، اس سے نبودِ جاوداں خوب!
نہ بھائی یہ فضائے نیلگوں کچھ　بلندی سے، وہ نیچا خاک داں خوب!

(۴)

خوشا انساں کہ جس کی جاں ہے بے تاب　جو اسپِ وقت پر بیٹھا ہوا ہے
قبائے زندگی ہے چست اس پر　کہ تازہ کار اس کی ہر ادا ہے

زندگی

یہ کہہ رہا تھا شب ابرِ بہار رورو کر
کہ زندگی تو فقط گریہ اور ماتم ہے

چمک کے برقِ سبک سیر یہ لگی کہنے
ہنہیں ہنہیں یہ تبسم ہے گرچہ یک دم ہے

نہ جانے کس نے خبر یہ چمن میں پہونچادی
مکالمہ گل و شبنم میں یہ جو باہم ہے

○

علم اور عشق کے درمیان مکالمہ

علم

نگہہ میری محیطِ کارِ عالم
کہ ہے میرا گرفتار اک زمانہ

نظر میری کھلی ہے اس جہاں پر
ہنہیں گردوں پہ میرا آب و دانہ

کہ میرے ساز میں نغمے بھرے ہیں
سرِرہ راز میرے سب کھلے ہیں

عشق

ترے افسوں سے شعلہ زار دریا ہوگیا ہے
ہوا ہے زہر آلود اور بنی آتش کدا ہے

جو میرا دوست ہوتا تو تو یکسر نور ہوتا
تبھی تو نور تیرا نار بن کر رہ گیا ہے

لیا ہے جنم گولاہوت کے خلوت کدے میں
مگر تو جال میں ابلیس کے جاکر پھنسا ہے

اب آ اس خاکداں کو گلستاں کر جہانِ پیر کو پھر سے جواں کر
اٹھا لے درد دل کا ایک ذرہ زمیں کو اک بہشتِ جاوداں کر
ہم آخر کو ہیں اک دوجے کے ہمدم
کہ زیر و بم اسی نغمے کے ہیں ہم

○

تاروں کا گیت

یہ گردش ہماری ، ہمارا نظام
یہ مستی ہماری ، ہمارا خرام
یہ گردش ہماری کہ ہے بے مقام
اسی میں ہماری حیاتِ دوام
کہ دورِ فلک ہے ہمیں بامرام یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام!

نظر میں لیئے جلوہ گاہِ شہود
یہ سارے صنم خانہ ہائے نمود
یہ ہنگامۂ رزمِ بود و نبود
یہ جو کشمکش ہے برائے وجود
یہ ، المختصر عالمِ دیر و زود یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام!

یہ جاری ہے جو گرمیِ کار زار
ہویدا ہے جو خامیِ پختہ کار
کہیں تخت و تاج اور کہیں تیغ و دار
کہیں خوار ہوتے ہوئے شہریار
یہ ہر روز کی بازیِ روزگار یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام!

گیا خواجہ اور خواجہ کی سروری
غلاموں کی رخصت ہوئی چاکری
رہی اب وہ زاری نہ وہ قیصری
چلا بھی گیا دورِ اسکندری
نہ باقی رہا شیوۂ بت گری یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام

خروشندہ بھی ہے یہ خاکِ خموش
کبھی سست رو ہے کبھی سخت کوش
جمائے کہیں محفل نائے و نوش
تو نکلے کہیں پر جنازہ بہ دوش
ہے میرِ جہاں تو کہیں سُفتۂ گوش یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام!

تو محوِ طلسمات صد چون و چند
خرد تیری رہنِ کشاد اور بند
غزالوں کی صورت ہے زیرِ کمند
فقط خوار و زار و زبون و نژند
ہمارا نشیمن ہے لیکن بلند یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام!

یہ پردہ ہے کیا؟ اور کیا ہے ظہور؟
ہے کیا اصلِ ظلمت؟ ہے کیا اصلِ نور؟
دل و چشم کیا ہیں؟ یہ کیا ہے شعور؟
کسے کہتے ہیں فطرتِ ناصبور؟
یہ نزدیک کیا بات ہے؟ کیا ہے دور؟ یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام!

یہ تیرا زیادہ، ہمارا ہے کم
ہے جو سال تیرا، ہمارا ہے دم
ارے تیرے دامن میں ہیں بحرویم
مگر توکہ شبنم پہ دیتا ہے دم
تلاش عالموں کی ہمیں دم بہ دم یہ سب دیکھ کر ہم خراماں خرام!

١- غلام

نسیمِ صبح

محیطِ بحروبرِ کوہسار سے چل کر
میں آرہی ہوں مگر مجھ کو یہ نہیں ہے خبر

کہ میری اصل ہے کیا؟ میں کہاں سے نکلی ہوں؟
وطن ہے میرا کہاں؟، بس یہی میں سوچتی ہوں!

سنائی غم زدہ طائر کو میں نے خوش خبری
کہ آرہی ہے بہاراں کی دل نواز پری

گرائے میں نے ہی پھر اس کے آشیاں کے تلے
سفید پھول وہ چاندی سے کچھ چنبیلی کے

کبھی میں سبزے سے اٹکھیلیاں کئے جاؤں
تو شاخ لالہ سے لگ کر کبھی میں بل کھاؤں

کچھ ایسے اس کے مسامات میں سماؤں میں
کہ اس کی بو ہی نہیں رنگ بھی اڑاؤں میں

کچھ ایسے چھوتی ہوں میں برگ لالہ و گل کو
کہ میرے چھونے سے ان کی خمیدہ شاخ نہ ہو

کرے جو شاعرِ غم آشنا بھی آہ و بکا
تو ساتھ دیتی ہوں میں بھی نفس نفس اس کا

باز کی نصیحت اپنے بچے کو

ہے بازوں کا جوہر تو ایک اے پسر! دل شیر رکھتے ہیں، ہیں مشتِ پر
ہو خوش شیوہ اور نیک تدبیر جی جسور و غیور و کلاں گیر جی
نہ اپنا کبھی صحبتِ کبک و سار مگر یہ کہ ہو تجھ کو شوقِ شکار
ہے قوم ان کی چھوٹی، بڑی ترسناک[1] کہ کرتی ہے مٹی سے منقار[2] پاک
بنا باشہ[3]، صید اپنے نخچیر کا جب آئین و کیش اس کا اپنا لیا
گیا شکرہ جب بھی سوئے روئے خاک ہوا صحبتِ مرغکاں سے ہلاک
نظر خود پہ رکھ اور خورسند جی دلیر و درشت و تنومند جی
تنِ نرم و نازک ہے ہے تیہو کا تن ترا سخت ہو شاخِ[4] آہو سا تن
یہ سنگینیِ محنت و پردمی اسی سے مقدر میں ہے خرمی
کہے اپنے بیٹے سے کیا خوب عقاب کہاں قطرۂ خوں کہاں لعلِ ناب
حذر آہو و میش سے الحذر بزرگوں سی خلوت میں کر خوش بسر
یہ ہے بوڑھے بازوں کا قول اے پسر! درختوں پہ اپنا نشیمن نہ کر!
ہمارا نشیمن نہیں باغ و کشت ہمیں تو ہیں یہ کوہ و صحرا بہشت
زمیں سے ہے دانے کو چننا خطا ہے گردوں کی پہنائی حق کی عطا
وہ شاہیں جو رکھے قدم خاک پر ہے مرغِ سرا سے بھی وہ سفلہ تر
ہے شاہین کے حق میں اک فرش، سنگ کہ پتھر پہ چلنے سے ہوں تیز چنگ
کہ تو زرد چشمانِ صحرا سے ہے تری اصل سیمرغِ والا سے ہے
جوانِ اصیل اک بہ وقتِ جدال[5] پلنگوں[6] کی بھی مرونک[7] لے نکال
اڑانوں میں ہے سطوتِ نوریاں رگوں میں تری خونِ کافوریاں[8]
یہ گردونِ گرداں، ہے خم جس کی پشت وہیں ہے ترا رزقِ نرم و درشت
نہ کر دوسرے کا نوالہ پسند
کہ بن نیک! نیکوں کی رکھ یاد پند

(حاشیہ ۱ تا ۸ صـ۹۳ پر)

کتاب کا کیڑا

کتب خانے میں اپنے میں نے سنا ، شب
یہ پروانے سے بولا کرمِ کتابی

کہ اوراقِ سینا[1] میں ڈالا ہے ڈیرہ
پڑھا غور سے نسخۂ فاریابی[2]

مگر حکمتِ زندگی کھل نہ پائی
کرے دن کو تیرہ یہ بے آفتابی

تو پروانہ بولا جو تھا ادھ جلا سا
یہ نکتہ نہیں میرے بھائی ! کتابی

تپش ہی کرے زندہ تر زندگی کو
تپش ہی تو دے بال و پر زندگی کو

○

۱- بو علی سینا
۲- ظہیر فاریابی
} دیکھئے اشارات

(صـ۹۲ کا حاشیہ) ۱- ڈرنے والی ۲- چونچ ۳ باز کی قسم کا ایک شکاری پرندہ
۴- ہرن کے سینگ ۵- جنگ ، لڑائی ۶- پلنگ ، چیتا ۷- آنکھ کی پتلی
۸- شاہین کافوری کیونکہ اس کا رنگ سفید ہوتا ہے (مترجم)

کبر و ناز

بولی بڑے غرور سے یخ[1] جوئے[2] کوہ سے
تجھ سے ہمارا تلخ ہوا جائے روزگار

گستاخ تیرا گیت ہے ، بے باک تیری چال
ہر سال شوخ تر ہے تو آوارہ تر ہزار

تو خاندانِ کوہ کے شایان شاں نہیں
خود کو نہ کہہ تو دخترکِ ابرِ کوہسار

گرتی ہے ، لڑکھڑاتی ہے ، رلتی ہے خاک میں
لے اور کوئی رہ ، ہوروان سوئے مرغ زار

بولی ندی کہ " بات نہ کر ایسی دل شکن
خود پر اکڑ نہ ، چھوڑ یہ مَیں پن کا کاروبار

جاتی ہوں مَیں کہ مَیں نہیں اس کوہسار سے
خود کو بچا تو مہرِ درخشاں کی مار سے"

○

۱ برف ۲ پہاڑی ندی

لالہ

وہ شعلہ ہوں ازل کے دن آغوش عشق میں
پہلے ، نمود بلبل و پروانہ سے ، اٹھا

سورج سے بھی فزوں ہوں ، ہر اک ذرے پر محیط
گردوں نے اپنا شعلہ مری تاب سے لیا

مثل نفس ہوں سینۂ گلشن میں میں مقیم
نم کرکے مجھ کو شاخ نے خود میں سمولیا

کھینچا یہ میرا سوز، کہا میرے بر[1] میں رہ
لیکن دلِ ستم زدہ میرا نہ رہ سکا

میں تنگنائے شاخ میں کھاتا تھا پیچ و تاب
آخر کو سوئے جلوہ گہِ رنگ و بو گیا

شبنم نے میری راہ میں موتی بہت لٹائے
خنداں تھی صبح ، گرد مرے گھومتی صبا

بلبل نے گل سے جانا کہ میں کھوچکا ہوں سوز
رو کر کہا کہ ہستی کی مہنگی پڑی قبا

تب سے میں اپنا کھول کے سینہ پڑا ہوا
ہوں صبح و شام منت خورشید اٹھا رہا

اس آس میں کہ مجھ پہ کرم کی نظر پڑے
مل جائے مجھ کو شعلہ وہ واپس، جو بجھ گیا

○

۱۔ جسم

حکمت و شعر

بوعلی سینا ہوا ہے گم غبارِ ناقہ میں
دست رومیؔ کی رسائی پردۂ محمل تلک

غوطہ زن ہوکر وہ پہونچے گوہر تابندہ تک
بوعلی گرداب میں گم ، جیسے خسؔ منزل تلک

حق اگر بے سوز ہو تو حکمتِ بے مایہ ہے
شعر بن جائے' جو حکمت سوزِ دل سے کام لے !

○

حقیقت

عقابِ دوربیں نے مرغِ آبی سے کہا اک دن
ارے ہے یہ سراب! آنکھوں سے اپنی دیکھتا ہوں میں

جواباً مرغِ حق اندیش نے اس کو یہ بتلایا
فقط تو دیکھتا ہے ، یہ ہے پانی جانتا ہوں میں

وہیں آئی صدا ماہی کی اس گہرے سمندر سے
ارے یہ عالمِ پر پیچ و تاب اک اور ہی شئے ہے !

○

جگنو

اک ذرّہ بے مایہ متاعِ نفس جو لے کر آیا
پروانہ پن سیکھا، اس کو شوق نے اتنا تپایا!
دامنِ شب چمکایا
تھکی کرن اک چلی تھی، بن کر گرہ شرر بن بیٹھی
سوز تھا ایسا حیات کا اس میں یکسر زر بن بیٹھی
شاہ نظر بن بیٹھی
پروانہ جب بے تابانہ ادھر ادھر پر مارے
شمع سراپا بن جائے یوں شمع پہ خود کو وارے
"میں" اور "تو" سب ہارے
یا وہ کوئی تارا ہے اک چرخِ بریں پر اونچا
آیا ہے نزدیک سے کرنے اس دنیا کا تماشا
ایک کمیں میں بیٹھا
یا پھر وہ اک چاند ہے جو بس ایک جھلک دکھلائے
سورج کی کرنوں کا کوئی احسان نہ سر پر اٹھائے
آزاد رہے اور جائے!
اے شب کو چمکانے والے! تو ہے سراپا نور
تیری یہ پرواز ہے کیا؟ اک عالمِ غیب و حضور
اور اک آئینِ ظہور!

تیرہ شبوں میں تیرے ہستی اک مشعل ہے گویا
اللہ اللہ سوز یہ تیرا تاب و تب ہے سراپا
گرمِ طلب ہے ایسا

ہاں ہم بھی تو تیری ہی مانند اس خاک سے اٹھے
دیکھ دیکھ کر تڑپے ہیں ہم ، نہ بھی دیکھیں تو تڑپے
اور کہیں نہیں پہونچے

سن لو میری بات کہ اس کی بڑی ہے گہری تھاہ
کھوئی ہوئی منزل کی نہ پوچھو ، پکڑو اپنی راہ
اس جلوے پہ رکھو نگاہ !

○

حدی

(ساربانِ حجاز کا گیت)

ناقۂ گرداں مرے
میرے ہرن دوڑتے
زر مرے ، زیور مرے
بیش مرے ، کم مرے
اے مرے دولت کدے!
گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں!

دل کش و زیبا ہے تو
شاہدِ رعنا ہے تو
حورِ دل آرا ہے تو
غیرتِ لیلا ہے تو
دخترِ صحرا ہے تو
گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں!

تیز ہو جب آفتاب
تجھ کو ہے پانی سراب
جب ہو شبِ ماہتاب
دوڑے تو مثلِ شہاب
دور ہے آنکھوں سے خواب
گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں!

لکّۂ ابرِ رواں
کشتیِ بے بادباں
مثلِ خضر راہ داں
تجھ پہ سبک ہر گراں
تحتِ دل سارباں
گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں!
سوز ہے تیری زمام
ساز ہے تیرا خرام
خالی شکم، تشنہ کام
پابہ سفر صبح و شام
خستہ ہو کر کے مقام
گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں!
شام یمن میں تری
صبح قرن میں ہوئی
ریت ترے پانو کی
نرم و سبک پھول سی
ہرنی ختن کی کوئی
گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں!

ختم سفر چاند کا
وادیوں میں جا چھپا
صبح کا چہرہ کھلا
چاک ہے شب کی قبا
آئی وہ ٹھنڈی ہوا
گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں!
نغمہ مرا دل کشا
اس کی ہے لے جاں فزا
صورتِ بانگِ درا
فتنہ ربا، فتنہ زا
اے بہ حرم چہرہ سا!
گام اٹھا تیز تر دور وہ منزل نہیں!

○

بارش کا پہلا قطرہ

مرا معنیٰ تازہ ہے مدعا
اگر پھر کہوں تو نہیں ناروا !
کہ اک قطرہ بارش کا گرنے کو تھا
جو دریا کو دیکھا خجل ہوگیا
کہ دریا کہاں اور یہ میں کہاں
وہ ہستی ہے میں نیستی ، الاماں
مگر آئی دریا سے فوراً صدا
تنک مایگی سے نہ منہ یوں چھپا
نظر میں ہیں تیری چمن، دشت و در
کیا ہے تماشائے شام و سحر
ہے گہہ برگ پر ، گہہ بہ دوشِ سحاب
کبھی تجھ کو چمکاتا ہے آفتاب
کبھی تشنہ کاموں کا ہمدم ہے تو
کبھی سینۂ چاکوں کا محرم ہے تو
کبھی تاک میں ہے تو طاقت گداز
کبھی خاک میں مل کے بے سوز و ساز
تو پیدا ہوا ہے مری موج سے
مجھی سے تو ابھرے مجھی میں ملے
کر آرام آکر مرے سینے میں
چمک مثل جوہر اس آئینے میں
گہر بن کے آغوشِ قلزم میں جی
ہے روشن سوا زندگی

خدا اور انسان کے درمیان ایک مکالمہ

خدا

بنایا جہاں میں نے اک آب و گل سے   تو ایران و تاتار تو نے بنائے

نکالا ہے مٹی سے فولاد میں نے   تو تیر اور تلوار تونے بنائے

شجر کاٹنے کو تبر تو نے ڈھالا

بنایا قفس طائرِ نغمہ زن کا !

انسان

رات بنائی تو نے اگر تو میں نے چراغ بنایا

تو نے بنائی مٹی اگر تو میں نے ایاغ بنایا

تو نے بنائے اگر بیابان و کہسار و راغ

کئے آراستہ میں نے خیابان و گلزار و باغ

میں وہ ہوں جو پتھر سے بھی اک آئینہ بنالوں

ہاتھ آجائے زہر تو [illegible] بنالوں

ساقی نامہ

(نشاط باغ کشمیر میں لکھا گیا)

زہے موسمِ گل ، خوشا نو بہاراں — اُگے ماہ پرویں سرِ مرغزاں
چکوروں کے پر جیسی خوش رنگ دھرتی — یہ ہر سمت فوارے الماس باراں
فقط لالہ و گل پہ ٹھہریں نگاہیں — تو سبزے سے لپٹے ہوائے بہاراں
لبِ جو پہ غنچے کی آئینہ بندی — نہیں ہونگے ایسے بھی آئینہ داراں
یہ شیریں نوائیں ، یہ دل کش صدائیں — اٹھی ہیں سرِ خلوتِ شاخساراں
پڑی تن میں جاں ، جاں میں جاگیں امنگیں — و یہ آوائے ساراں ، یہ بانگِ ہزاراں
طیور بلند آشیاں کے یہ نغمے — گھلے مل کے با نغمۂ جوئباراں
یہ گویا بہشت بریں اک خدا نے — بنائی سرِ دامن کوہساراں
کہ رحمت سے اس کی ذرا آدمی کی — گھٹے زحمتِ انتظارِ نگاراں
تو چاہوں بھی کیا میں ، اگر میں نہ چاہوں — شراب و کباب و رباب و نگاراں
ترے صدقے ! اے ساقیِ ماہ سیما ! — کوئی یادگارِ بہارانِ یاراں
چمک جس کی نوری ، جلانے میں ناری — کر ایسا عطا ساغرِ مے گساراں
اٹھا خاکِ مردہ سے اک قومِ زندہ — بہشت بریں اک پئے خاکساراں
کہ کاشاں سے تا کاشغر اٹھ رہی ہے — بہ ہر سو ، وہی اک صدائے بہاراں
گرائے ہیں وہ اشک ناب ان امم نے — کہ کانٹوں سے پھوٹیں گلِ نو بہاراں
غلامی کے خوگر یہ کشمیر باسی — ہوئے ساجدِ سنگ ہائے مزاراں
خیالِ بلند ان کے دل میں نہ آئے — خودی ناشناساں ، زِ خود شرم ساراں
بریشم قبا خواجہ محنت سے ان کی — مگر چاک ہے جامۂ حسن کاراں
فروغِ نگہ ہے نہ آنکھوں میں ان کی — نہ سینے میں ان کے دلِ بے قراراں

چھڑک قطرہ اس مئے کا کشمیریوں پر
کہ خاکستر ان کی بھی ہو شعلہ باراں

○

مراد حوانِ بہشت (مترجم)

شاہین و ماہی

ماہی بچہ شاہیں بچے سے کہتا تھا اک دن
یہ سلسلہء موج کہ ہے دریا ہی دریا

ہے خوف کا گھر، بڑھ کے ہے بادل سے گرج دار
اک خانہ ہے ہر دیدہ و نادیدہ بلا کا

ہے سیلِ گراں سنگ، رواں اور زمیں گیر
تابندہ گہر جس میں ہیں اور لولوئے لالا

اس سیلِ ہمہ گیر سے بچنا نہیں ممکن!
ہے سر پہ وہی اور تہِ پا و ہمہ جا

ہر لحظہ جواں اور رواں اور دواں ہے
ایام کی گردش سے نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا

ان باتوں سے اس بچے کا چہرہ چمک اٹھا
شاہیں بچہ ہنستا ہوا پر کھول کے نکلا

بولا "میں ہوں شاہیں مجھے کیا کام زمیں سے
نیچے مرے پر کے ہیں وہ دریا ہو کہ صحرا

چھوڑ اب یہ سر آب ہو پہنائے ہوا میں
مجھ جیسے وہی جس کو ملا دیدۂ بینا!

○

تنہائی

گیا میں سوئے بحر اک دن ، کہا یہ موجِ مضطر سے
تجھے بس اک طلب ہے ، یہ بتا مشکل ہے کیا تیری
ہزاروں لولوئے لالہ سے پُر تیرا گریباں ہے
درونِ سینہ میرا سا ، بتا رکھتی ہے تو دل بھی ؟
تڑپ کر ایک دم ساحل سے نکلی اور چپ سادھی !

چلا پھر کوہ کی جانب ، کہا کیا ہے یہ بیدردی
کہ کانوں تک ترے آہ و فغان غم زدہ پہونچی ؟
یہ سنگِ لعل تیرا قطرۂ خوں سے بنا ہے گر
ادھر آ اور یہ مجھ غم زدہ سے بات کر تھوڑی
یہ خود گم ہو کے گہری سانس کھینچی اور چپ سادھی !

کیا طے اک سفر لمبا ، کہا ماہِ درخشاں سے
سفر ہی تیری قسمت ہے ، تری منزل بھی ہے کوئی ؟
ترے پرتو سے یہ سارا جہاں ، ٹھہرا سمن زار اک
چمک داغوں کی تیرے ، جلوۂ دل سے ، بتا ہے بھی ؟
رقیبانہ سوئے انجم نظر کی اور چپ سادھی !

گیا پھر حضرتِ یزداں میں ، ماہ و مہر سے گزرا
تری دنیا میں اک ذرہ نہیں ہے آشنا میرا
جہاں تیرا تہی دل ہے ، یہ مشتِ خاک دل ہی دل
چمن یہ خوب ہے ، پر کب ہے در خوردِ نوا میرا
ہنسی سی ایک اس کے لب پر آئی اور چپ سادھی !

○

شبنم

فرمایا کہ اوجِ مہ و پرویں سے اتر آ !
خود ہو کے فنا ، بحرِ پر آشوب میں مل جا
موجوں سے لپٹ جا
اک نقشِ دگر لا !
بن موتی چمکتا

اور میں نے کبھی عشرتِ دریا نہ خریدی
وہ مئے جو کرے مجھ سے مجھے دور، نہ چکھی
اور خود کو نہ ہاری
آفاق سے اتری
اور لالے پہ ٹپکی

گل پوچھے ہے ہنگامۂ مرغانِ سحر کیا ؟
ہے انجمن آراستہ بالائے شجر کیا ؟
ہے زیر و زبر کیا ؟
پایانِ نظر کیا ؟
خارِ گلِ تر کیا ؟

تو کون ہے ؟ میں کون ہوں ؟ یہ ہم نفسی کیا ؟
شاخوں پہ مری کیسا یہ بلبل کا ہے نغمہ ؟
مقصودِ نوا کیا ؟
مطلوبِ صبا کیا ؟
ہے گہنہ سرا کیا ؟

میں نے کہا، یہ رزم گہِ زیست ہے بھائی!
اس بزم کا شیرازہ ہے گیا، ذوقِ جدائی!
دم، گرم نوائی
جاں، چہرہ کشائی
ہے رازِ خدائی

افلاک سے میں ٹپکی ہوں، تو خاک سے پھوٹے
ہے ذوقِ نمود اب کوئی پھوٹے کوئی ٹپکے
تو شاخ میں تڑپے
چھیڑے کئی پردے
اور آپ کو پہونچے

نم ہے رگِ دوراں میں مرے اشک سحر کا
یہ زیر وزبر کچھ نہیں دھوکا ہے نظر کا
تارا مرے بر میں
بیٹھا ہے جگر میں
ہے نور بصر میں

گو خار بھی ہے پیرہنِ شاہد گل میں
یہ بھی ہے مگر انجمنِ شاہد گل میں
بس عشق میں تڑپے
پہلو میں ہے گل کے
ہے موسمِ گل سے

اٹھ ! صحبت دیرینہ سے دل اپنا اٹھالے
اور لالہ۔ خورشید سے آنکھ اپنی لڑالے
کر مجھ سے ذرا ساز
بن مجھ سا فلک تاز
ہے بھی سر پرواز ؟

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

جگنو

سنا میں نے ، یہ جگنو کہہ رہا تھا
کہ میں کیڑا ہوں لیکن بے ضرر ہوں

جلا جاسکتا ہے بے منّتِ غیر
میں پروانہ کہاں اے بے خبر ہوں

ہے تیرہ شب تو کیا ، خود کو جلاکر
خود اپنا میں چراغِ رہ گزر ہوں

عشق

فکر نے میری اٹھایا جستجو میں جب قدم
دیر میں پہونچی ، کبھی تھی برسرِ صحنِ حرم

دوڑتی دشتِ طلب میں پھرتی تھی شام و سحر
اک بگولے کی طرح دامن کو اپنے کھینچ کر

بے خضر اس راستے میں تھی سوئے منزل رواں
دوش پر تخئیل کے تھی باندھ کر محمل رواں

توڑ کر ساغر تلاشِ مئے میں سرگرداں پھری
صبح کے مانند محوِ سعیِ لاحاصل رہی

موج کے مانند کھاتی تاؤ اپنے آپ پر
اور صحرا کے بگولے کی طرح آوارہ تر

عشق تیرا دل پہ تب ناگاہ مستولی ہوا
ہر گرہ کاموں کی میرے کھل گئی صلِّ علیٰ

ہوگیا تب فاش مجھ پر سِرِّ ہر بود و عدم
عقل کا بت خانہ میرا بن گیا صحنِ حرم

میرے خرمن سے ہوا پھر برق کا ایسے گزر
جلنے میں لذت ہے کیا ، یہ ہوگئی مجھ کو خبر

ہوگیا سرمست اتنا ، لڑکھڑا کر گر پڑا
عکس صورت ہوگیا میں آپ اپنے سے جدا

عشق میری خاک کو پھر عرش پر پہونچا گیا
راز اک ایسا مرے دل کے حوالے کردیا

ہوگیا کشتی کا میری اس کے ساحل سے وصال
ہوگیا ہر زشت میرا نذرِ طوفان جمال

اب تو میں ہوں اور مرے لب عشق کے افسانہ چیں
کوئی پروائے ملامت اب مرے دل کو نہیں

علم کے جلووں سے اب میں ہوگیا ہوں بے نیاز
تپ رہا ہوں ، رو رہا ہوں ، سر بہ سر سوز و گداز

اگر جینا ہے خطروں سے الجھ جا!

ہرن یہ کہہ رہا تھا اک ہرن سے
"سپۂ صحنِ حرم میں چل کے ڈھونڈیں

کہ صحرا میں شکاری تاک میں ہیں
نہ تو صبحیں ہماری ہیں نہ شامیں

کہاں تک فتنۂ صیاد جھیلیں
دل اس اندیشے سے آزاد رکھیں!"

رفیق اس کا یہ بولا "اے خرد مند!
اگر جینا ہے خطروں سے الجھ جا

کسوٹی پر مسلسل آپ کو رکھ!
زبانِ تیغ پر چلنا ہے جینا!

خطر تاب و تواں کا امتحاں ہے
عیارِ ممکناتِ جسم و جاں ہے"

جہانِ عمل

یہ میکدہ ہے اور یہاں ہے صلائے عام
ملتی ہے مئے یہاں تو بہ اندازہ ہائے جام

وہ حرفِ راز جو کہ نہیں صوت آشنا
ٹپکے ہے لب سے جام کے، ٹھہرا ہے وہ کلام

نشّہ چڑھا ہے حال کا، چھوٹا مقامِ قال
اور نکتہ ہائے فلسفہ کچھ ہیں تو دُردِ جام

اس راہ میں تو دہر کی ہم نے تھکا دی سانس
خورشیدِ صبح اس کا ہے یاں آفتاب شام

اے وہ کہ اپنی بھول پہ بھولا ہوا ہے تو ا
ساکن جسے تو سمجھے ہوئے ہے وہ ہے خرام

گھر سے نکل کے پائے طلب ہو سکے نہ شل
جاں میں جو بویا بیج تو پیدا ہوا عمل

زندگی

پوچھا یہ اک بلند نظر سے، ہے زیست کیا ؟
بولا وہ مئے کہ تلخ ہو جتنی، ہے خوب تر !

پوچھا کہ کیوں یہ جگنو نے گل سے نکالا سر ؟
بولا ہے شعلہ زاد سمندر سا ، اے پسر !

پوچھا کہ کیوں یہ فطرتِ خاموش میں ہے شر ؟
بولا کہ اس کا خیر نہ دیکھا یہی ہے شر !

پوچھا کہ شوقِ سیر کی منزل نہیں ہے کوئی ؟
بولا کہ منزل اس کی یہی لذت سفر !

پوچھا کہ کیوں یہ سونپتے ہیں خاک میں ؟
بولا کہ دانہ پھوٹے تو ہے پھول سر بہ سر !

○

حکمتِ فرنگ

سنا میں نے فارس میں اک شخص تھا   سخن رس ، ادا فہم ، رمز آشنا
بڑی جاں کنی سے گزر کر مرا   تھا دل جاں کنی سے شکایت بھرا
گیا نالہ کش پیشِ یزدانِ پاک   " اجل نے کیا میرا دل چاک چاک
نہیں سیکھا بالکل بہ ایں یک فنی   اجل نے فنِ تازۂ جاں کنی
ہے ناپختہ یکسر ہر اک کارِ مرگ   جہاں نو ہوا ، وہ وہی کہنہ برگ[1]
فرنگی کے سارے ہنر ہیں شگرف[2]   وہ قطرے سے پیدا کرے بحرِ ژرف[3]
گھماتی ہے فکر اس کی پرکارِ مرگ   کہ حکمت ہے اس کی پرستارِ مرگ
ہیں مثلِ نہنگ آب دوزیں رواں   تو طیارے اس کے ہیں شعلہ فشاں
کہ چشمِ جہاں بینِ خورشید بھی   نئی اس کی گیسوں سے اندھی ہوئی
جو بندوق سے اس کی گولی چلے   اجل کے فرشتے کی جاں پر بنے
اس احمق کو اب بھیج سوئے فرنگ
کہ سیکھے فنِ کشتنِ بے درنگ[4] " !

۱۔ پرانی طرز   ۲- نادر   ۳- [illegible]   ۴- [illegible]

حور و شاعر

(گوئٹے کی نظم موسوم بہ "حور و شاعر" کے جواب میں)

حور

نہ تو مئے کو منہ لگائے نہ نگاہ مجھ پہ ڈالے
ہے عجب کہ تو نہ جانے رہ و رسمِ آشنائی

ہمہ سازِ جستجو ہے، ہمہ سوزِ آرزو ہے
یہ تری نفس گدازی، یہ تری غزل سرائی

کرے اپنی لے سے پیدا وہ جہانِ دل کشا تو
کہ ارم دکھائی دیتا ہے طلسمِ سیمیائی!

شاعر

یہ تری چبھتی ہوئی باتیں ہیں بے حد دل فریب
پھر بھی نوکِ خار کی لذت ہے کچھ اس سے سوا!

کیا کروں لکھا نہیں ہے میری فطرت میں قیام
میرے سینے میں دلِ مضطر ہے اک مثلِ صبا

جب نظر رکھتی ہے میری اک نگارِ خوب پر
تب نگارِ خوب تر کو ڈھونڈتا ہے دل مرا

میں شرر سے تارہ ڈھونڈوں تارے سے پھر آفتاب
شوقِ منزل ہی نہیں، ہے موت رک جانا مرا

جب بہاروں کی شرابوں سے میں بھرتا ہوں قدح
تو غزل سے اپنی پھر اک چھیڑتا ہوں سُر نیا

ہے طلب مجھ کو ہنایت کی ، جو ہے بے انتہا
بارگاہِ ناشکیب و قلبِ امید آشنا

عاشقوں کا دل تو مرجاتا ہے باغِ خلد میں
غم نہ کوئی غم گساری اور نہ پُر درد اک نوا !

○

تہذیب

انساں کہ جس نے غازۂ تہذیب تھوپ کر
چہرے کو اپنے تازہ و روشن بنالیا

دستانۂ حریر میں پنجے کو ڈھانپ کر
خنجر چھپا کے اس نے قلم کو اٹھالیا

ڈالی طرح صنم کدۂ صلحِ عام کی
رقصاں ہوا ، سرود کا جادو جگالیا

خون ریز ہو کے جنگ کے چھڑتے ہی کھل گیا
اک دوسرے کو دشمن خونیں بنالیا !

○

زندگی و عمل

(ہائنا کی نظم موسوم بہ "سوالات" کے جواب میں)

اکتا گیا تھا جینے سے ساحل پڑے پڑے
بولا کہ مجھ پہ کھل ہی نہ پایا میں کون ہوں
سن کر یہ موجِ تیز خرامیدہ نے کہا
ٹھہروں تو میری موت ہے، زندہ ہوں جب چلوں!

○

الملکُ لِلّٰہ

طارق نے اندلس میں جلائیں جو کشتیاں
بولے "خرد کی رو سے سراسر ہے یہ خطا
ہم دور ہیں وطن سے سولوٹیں گے کس طرح
ترکِ سبب کا حکم شریعت نے کب دیا؟"
طارق نے ہنس کے تھام لی شمشیر اور کہا
"میرے خدا کا ملک ہے جو ملک ہے مرا"

○

جوئے آب

دیکھو تو جوئے آب رواں مست مست ہے — مانندِ کہکشاں سوئے گلزار و مَرغ زار
اک عمر رہ کے ابر کے جھولے میں مستِ خواب — کھولی پھر اس نے آنکھ بہ آغوشِ کوہسار
تھے سنگریزے نغمہ گر اس کے خرام سے — آئینہ ساں جبیں ہوئی بے رنگ و بے غبار

کیا خوب جوئے آب ہے مستانہ خوش خرام
خود سے یگانہ ، سب سے ہے بیگانہ خوش خرام

لے کر بہار آئی پری خانہ راہ میں — نرگس کھلی ، چنبیلی کھلی ، موتیا کھلا
عشوے دکھا کے گل نے کہا اک ذرا ٹھہر ! — دامن پکڑ کے غنچہ اسے کھینچنے لگا
وہ سبز پوش جلوہ فروشوں سے بے نیاز — اپنا بناتی وادی و صحرا میں راستا

کیا خوب جوئے آب ہے مستانہ خوش خرام
خود سے یگانہ ، سب سے ہے بیگانہ خوش خرام

سب جوئے دشت و مرغ و کہستان و باغ و راغ — بولے کہ " ہو بسیطِ زمیں تجھ کو سازگار
ہم کو بنی ہماری تنک آبی سدِّ راہ — خود کو بچا تو ریگِ بیاباں سے اے نگار !
ہر سمت کی ہواؤں پہ سینے کو وا کرے — لپٹائے سارے ہم سفرانِ زبون و زار

کیا خوب جوئے آب ہے مستانہ خوش خرام
خود سے یگانہ سب سے ہے بیگانہ خوش خرام

دریائے پُر خروش نے توڑے تمام بند — وادی سے نکلی کوہ و کمر سے گزر گئی
طے کر کے مثلِ سیل نشیب و فراز سب — ایوانِ شاہ و کشت و چمن زار روندتی
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار — نقشِ کہن مٹاتی اور اپناتی تازگی

کیا خوب جوئے آب ہے مستانہ خوش خرام
خود سے یگانہ سب سے ہے بیگانہ خوش خرام

○

نوٹ : " جوئے آب " گوئٹے کی مشہور نظم " نغمۂ محمدؐ " کا ایک نہایت آزاد ترجمہ ہے - اس نظم میں ، جو دیوان مغربی سے بہت پہلے لکھی گئی تھی ، المانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے - اصل میں یہ ایک مجوزہ اسلامی ڈرامے کا جزو تھی ، جس کی تکمیل اس سے نہ ہو سکی اس ترجمے سے صرف گوئٹے کا نقطہ نگاہ دکھانا مقصود ہے - (اقبال)

عالمگیرؒ کا خط

(اپنے ایک فرزند کے نام جس نے ان کے مرنے کی دعا کی تھی)

نہ جانا ہے یزداں بڑا پختہ کار
یہاں اس نے دیکھے ہیں تجھ سے ہزار
بہت رہ چکے ہیں یہاں سینہ چاک
سنے جن کے نالے بڑے دردناک
کئی مثلِ شبیرؓ خوں میں نہائے
مگر اس کے لب پر نہ اک نالہ آئے
نہ تڑپا وہ رونے سے یعقوبؑ کے
نہ اک آہ کی دردِ ایوبؑ سے
نہیں ہوگا وہ کہنہ نخچیر گیر
کبھی تیرے دامِ دعا میں اسیر

○

بہشت

عجب کچھ ہے جنت کا بھی روزگار
کہ گردش میں گردونِ گرداں نہیں
نہیں دردِ زنداں کا یوسف کو علم
زلیخا لیے قلبِ نالاں نہیں
مقابل نہیں آگ کے واں خلیلؑ
کلیمؑ اس جگہ شعلہ درجاں نہیں
نہیں اس کی کشتی کو صرصر کا خوف
کوئی خطرۂ زورِ طوفاں نہیں
یقیں کی نہیں گھات میں بیم و شک
کوئی وصل کو خوفِ ہجراں نہیں
کہاں لذتِ عقلِ آوارہ گام
اگر راہِ منزل کی پیچاں نہیں
ہے جنت عجب عالمِ کورِ ذوق
کہ یزداں ہی ہے شیطاں نہیں

○

کشمیر

چلنا ہے کاشمر کو چل ! کوہ وتل و دمن تو دیکھ
سبزہ تو دیکھ گام گام ، لالہ چمن چمن تو دیکھ
بادِ بہار موج موج مرغِ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج برسرِ نارون تو دیکھ !
تانہ ہو اس کے حسن پر چشمِ سپہر فتنہ باز
روئے زمین پر ذرا برقعِ نسترن تو دیکھ !
لالہ کھلا ہے خاک سے ، موج رواں ہے آب میں
خاکِ شرر شرر کہیں آبِ شکن شکن تو دیکھ !
ساز کو نغمہ ریز کر ، مئے سے تو اپنا جام بھر
قافلۂ بہار کو انجمن انجمن تو دیکھ !
بعد میں اپنے آپ پر ایک نگاہ مختصر
پہلے تو روئے دل کشِ دخترِ برہمن تو دیکھ !

عشق

جس عقل کا اک جلوہ عالم کو جلا ڈالے !
وہ عشق ہی سے سیکھے آئینِ جہاں تابی
یہ عشق ہی ہے جس پر ہر کیفیت آتی ہے
از تاب و تبِ رومی تا حیرتِ فارابی
یہ حرف نشاط آور کہہ کہہ کے میں رقصاں ہوں
دل عشق سے سکھ پائے بااین ہمہ بے تابی
ہر معنئِ پیچیدہ لفظوں میں نہیں کھلتا
ہاں ڈوب ذرا دل میں شاید ہو سخن یابی

بندگی

(عبدیت)

رات اک میکدے میں مغ بچۂ بادہ فروش
کہہ رہا تھا کہ مری بات کر آویزۂ گوش
ہے یہی بادہ گسارانِ کہن کا مشرب
کہ تو مئے خانے سے اٹھ! باہمہ مستی، ہمہ ہوش
نکتۂ شوق بیاں شوق سے کر، ہونٹ نہ سی!
پر نہ دامانِ ادب چھوٹے، بن ایسا مئے نوش
جو ہرِ ذوقِ طلب رکھتے ہیں، ہم گرد راہ
بندگی دے کے خدائی نہ خرید اے کم کوش

○

غلامی

آہ! آدم نے سدا بندگی آدم کی
اس کو دولت جو ملی نذرِ قباد و جم کی
یعنی اس خو میں وہ کتوں سے فروتر نکلا
سگ کے آگے کبھی سگ نے نہ یوں گردن خم کی!

○

چیستانِ شمشیر

ہے بخت کوش کون جو پتھر سے کھینچے آب
محتاجِ خضر مثلِ سکندر کبھی نہ ہو!
مثلِ نگاہِ دیدۂ نم ناک پاک رو
دریا میں دامن اس کا مگر تر کبھی نہ ہو!
مضمون اس کا ایک ہی مصرع میں ہو تمام
منت پذیرِ مصرعِ دیگر کبھی نہ ہو

○

جمہوریت

حرفِ بیگانہ کے معنی دوں ہنادوں سے نہ پوچھ
چیونٹیوں میں شوخیِ طبع سلیمانی نہ آئے
طرزِ جمہوری نہ اپنا ، بن غلام پختہ کار
مغزِ دو صد خر سے ہرگز فکرِ انسانی نہ آئے

○

فرنگستان میں مبلّغِ اسلام

سے خطاب

بھڑک اٹھی ہے زمانے میں آتشِ نمرود
کہ آشکار ہو پھر جوہرِ مسلمانی

اب آکہ داغِ جگر سے اٹھائیں سب پردے
کہ آفتاب کی ظاہر ہوئی ہے عریانی

یہ تیری نکتہ فروزی فرنگیوں کے لیئے
صنم گداز ہے تیرا یہ علمِ برہانی

پیام شہرِ سلیمیٰ کا دے حجازی کو!
شرارِ شوق سے بھڑکا ضمیرِ تورانی

رہِ عراق○ و خراساں○ لے اے مقام○ شناس
عجم کی بزم میں کر تازہ وہ غزل خوانی

کہ زخمہ ور کے، زمانے سے انتظار میں ہیں
وہ نغمے خوں نہ ہوئے جو بہ سازِ افغانی

سنا نہ اہلِ ہوس کو حدیثِ عشق و جنوں
نہ چشمِ مور۱ میں بھر سرمۂ سلیمانی!

○

○ عراق و خراسان و مقام اصطلاحاتِ موسیقی ہیں (اقبال)
۱۔ چیونٹی

غنی کشمیری

غنی وہ سخن گوئے بلبل صفیر
نوا سنجِ کشمیر جنت نظیر

ہو گھر میں تو رکھتا مقفل وہ گھر
نکلتا جو گھر سے ، کھلا رکھتا در

کسی نے کہا - شاعر خوش نوا !
یہ تیرا طریقہ ہے سب سے جدا

ہوا لب کشایوں وہ مرد فقیر
فقیر اور ہے اقلیمِ معنی امیر

جو تم دیکھتے ہو ، یہی ہے روا
کہ میرے سوا گھر میں رکھا ہے کیا

غنی گھر میں جس وقت ہو گوشہ گیر
تو خود ہے متاعِ گرانِ فقیر

وہ جب محفل افروزِ خانہ نہیں
تو خالی پھر ایسا ٹھکانہ نہیں !

مصطفیٰ کمال پاشا سے خطاب

(جولائی ۱۹۲۲ء)

کسی امّی کی یہ حکمت کی تھی تاثیر کہ ہم
واقفِ سرِّ نہاں خانۂ تقدیر ہوئے
ہم تو کچھ بھی نہ تھے، جز یک شررِ باختہ رنگ
کی نظر اس نے کہ خورشیدِ جہاں گیر ہوئے
عشق کا داغ ہی جب پیرِ حرم دھو بیٹھا
دہر میں خوار بہ اندازۂ تقصیر ہوئے
اپنی فطرت کے موافق تھی ہوائے صحرا
کھا کے گلشن کی ہوا غنچۂ دل گیر ہوئے
غلغلہ وہ جو گیا گنبد گردوں سے پرے
بن گیا نالہ جو پابندِ بم و زیر ہوئے
تھا کبھی صید، بناد ام بچھائے ہی اسیر
رکھ کے ہم تیر و کماں کشتۂ نخچیر ہوئے
جس طرف راہ ہو، دوڑائے جا گھوڑے اپنے
مات ہی کھائی ہے جب موردِ تدبیر ہوئے!

○

طیارہ

سحردم کوئی طائر خوش نوا کسی اور طائر سے کہنے لگا
"ملے آدمی کو نہ یہ بال و پر زمیں گیر بن کر رہا عمر بھر"
کہاں میں نے "اے طائرِ خوش گلو کہوں حرفِ حق میں تو غم گیں نہ ہو
بنائے ہیں طیارے سے بال وپر نکالی سوئے آسماں رہ گزر
وہ طیارہ وہ مرغِ گردوں سپر فرشتے کے پر سے جو ہے تیز تر
ہے اڑنے میں شاہیں، بہ طاقت عتاب نظر اس کی لاہور تا فاریاب
فلک پر خروشاں ہے اور تند جوش زمیں پر ہے ماہی کی صورت خموش
خرد، خاک سے ڈھال لے جبرئیل زمیں سے فلک کی طرف اک دلیل"
سنا مرغِ زیرک نے یہ حرفِ تر کی اک آشیانہ مجھ پر نظر
پروں سے کی منقار صاف اور کہا "سخن میرا تجھ پر نہیں کھل سکا
الم نشرح ہیں تجھ پہ سب چون چند ہیں جادو میں تیرے یہ پست و بلند
"کبھی ٹھیک بھی کارِ دنیا کیا؟
کہ یوں آسمانوں پہ اڑنے لگا!"

(سعدیؔ)

○

عشق

وہ حرف دل فروز کہ راز اب نہیں رہا
تجھ کو بتاؤں کس کو یہ کس نے سنادیا
شبنم نے آسماں سے سنا، گل سے کہہ دیا
بلبل نے گل سے سن کے صبا کو بتادیا

○

مٹی باقی

مئے باقی

(۱)

بہاروں نے سجائی آکے بزمِ نغمگی ایسی
نوا بلبل کی سن کر آنکھ غنچوں نے بھی وا کر دی

گماں مت کر ازل میں ڈھل چکی ہے اپنی یہ مٹّی
وجودی بحر میں ہم ہیں کوئی موجِ خیال اب بھی!

نہ کریوں علم پر غرّہ ہے کارِ مئے کشی شئے اور
فقیہِ شہر کی ہے آستیں بھی تر، گریباں بھی!

بہاروں نے کیئے بکھرے ہوئے سب برگِ گل یک جا
نگاہوں سے ہماری رنگِ آب و گل میں افزونی

جو اپنے پر نظر رکھے، نشاں اس کا ہے بس اتنا
کہ کرتا ہی نہیں وہ بات غائب کی، نہ حاضر کی

کہا کیا خوب پیرِ زندہ دل نے میکدے میں کل
کہ ابراہیمؑ بھی ہر دور میں ہیں اور آزر بھی

بنائے آہ! کیا کیا نقش میں نے بزمِ ہستی میں
نہیں تھا، جس کو ہونا تھا اور انہونی ہوئی ہونی

کر اہلِ دیر سے نرمی کہ ہے عشقِ غیور ایسا
بنائے بتکدہ رکھتا ہے قلبِ غزنوی میں بھی

نہ ہوگا مردہ زندہ نغمۂ دواؤد سے جیسے
یہ خاکِ ہند اٹھّ سے ہے نوائے زندگی خالی

(۲)

حلقہ گیر آج ہیں تربت پہ مری نوحہ گراں
دلبراں ، زہرہ و شاں ، گلبدناں ، سیم براں

باغ میں قافلۂ لالہ و گل اترا ہے
دیکھو تو آئے کہاں سے ہیں یہ خونیں جگراں

ڈھونڈتا کیا ہے سرِ مدرسہ تو دانش و ذوق
مئے ملے گی نہ سرِ کارگہِ شیشہ گراں

خرد افزا تھے مجھے درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروز ہوئی صحبتِ صاحب نظراں

چھیڑ وہ گیت جو اٹھے تری آب و گل سے
اے زِخود رفتہ ! تہی ہو زِ نوائے دگراں

کس کو معلوم کہ ہے میری بھی قیمت کوئی
ہوں وہ دولت کہ ہوئی دست زدِ بے بصراں

(۳)

فکر میری ہر زمانے میں تراشے بت نئے
آپھنسے اک بند میں ، گر ہو رہا اک بند سے

برسرِ بام آ ! الٹ کر اپنے چہرے سے نقاب
آرزو مند اور کوئی مجھ سا شاید ہی ملے

مجھ کو اپنے دیدۂ بینا سے خود غیرت سی آئے
پردہ اس رخ پر کروں اپنی نگاہِ شوق سے

اک نگہہ ، اک خندۂ دزدیدہ ، اک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبت اب قسم کیا چاہیئے

عشق پر نازاں ہوں ، جس نے اضطرابِ ہجر میں
جاں سے تیرے درد کے پیوند باندھے نت نئے

نالۂ بے باک تر کی خاطر اے مرغِ بہار
لے! حریمِ سینۂ سے میرے ذرا سی آگ لے!

چنگ تیموری گیا ، آہنگِ تیموری رہا
سن ذرا ، اب اک نیا سازِ سمرقندی بجے!

رہ نہ دے کعبے میں اے پیرِ حرم اقبالؔ کو
ہر زمانے میں ہیں اس کی آستیں میں بت نئے

(۴)

شکایت ہے مجھے اس دیدۂ بینا سے بس اتنی
کہ جب تو جلوہ آرا ہو، بنے پردہ نظر میری!

ذرا مجھ پا بہ گِل کا یہ پیام ان نوریوں کو دو
حذر اس خاک پیکر سے رہے جو محوِ خود بینی!

نوا پیرا ہیں اور بزمِ بہاراں میں ہیں سوزاں ہم
جلاتی ہے ہمارے بال و پر آہِ سحر گاہی

وہ مجھے کیا نوا میری جو ہو ناآشنا خود سے
جہاں ہے دوسرا میرا تو دنیا دوسری اس کی!

مثالِ لالہ اک گلشن کے گوشے میں پڑا ہوں میں
کہ تاکا ہے جگر میرا ، نظر کے تیر نے اس کی

جفاؤں کے تعاقب ہی میں تو جیتے ہیں زندہ دل
نہ تھا اس راہ میں خطرہ ، نہیں لی راہ کعبے کی !

ہزاروں محفلیں آراستہ کیں ، پھر کیا برہم
قمر کی شمع سے روشن سرائے ہے یہ ایسی ہی !

خود اپنی خاک سے تعمیر کر اک آدمِ نو کی
شرر کے اک تبسم کی طرح فرصت ہے یاں تھوڑی

نہیں ہے بوالہوس گر تو تو اک نکتہ کہوں گا میں
اگر ہوں بے اثر نالے تو ہوگا عشق پختہ بھی

عجم نے میرے نغموں سے پرانی آگ کی روشن
عرب ہے بے خبر میری نواؤں سے مگر اب بھی !

(۵)

میں تو اسی بہانے ہوا ہوں غزل سرا
محرم ملے تو دوں کوئی پیغامِ آشنا

خلوت میں ہے سخن بھی بڑا پردۂ حجاب
آنکھوں سے دل کی بات سنانا مجھے پڑا

کرتا ہوں دھو کے پاک نگہ جوئے اشک میں
یعنی ہے تیری دید کا درپیش مرحلہ

غنچے کی طرح کام میں میرے گرہ پڑی
میں شوقِ آفتاب میں ہر لمحہ کھل اٹھا

اس بحر میں ہوں میں تو بھلے یہ گماں نہ کر
رہتا ہوں میں سدا کسی ساحل کو ڈھونڈتا

پروا نہیں ہے سیل کی مجھ کو کوئی کہ خود
ہوں مثلِ موج سازِ وجود ایک بحر کا

ہے دیدہ و نظر سا مرا اور اس کا ربط
میں اس سے لاکھ دور رہوں ، اس کا ہوں سدا

نقشِ جہاں یہ پردہ بنا میری آنکھ کا
جادو کا اس کے میں بھی گرفتار ہوگیا

گنبد یہ ، جس کے بند ہیں در ، کیا سماؤں میں
میں پہلوئے فلک میں کھٹکتا ہوں خار سا

پرواز مجھ کو رکنے نہ دے آشیانے میں
گہ شاخ پر تو گاہ لبِ جو ہوں گھومتا

(۶)

پردگیانِ ساز کے رخ سے نقاب رخ اٹھا
مرغِ نوا طراز کو گیت نئے نئے سکھا

راہروؤں کے خوں سے راہ، موسمِ گل میں فرشِ گل
قافلۂ نیاز کو لوٹے، یہ کس کا ناز تھا!

دیدۂ خواب ناک اگر اس نے کیا چمن پہ وا
نرگسِ نیم باز کو ذوقِ نظر بھی کر عطا

خلوتیانِ راز سے کہتا کہ بچے بچے کی
آج زباں پہ آگیا حرفِ نگفتہ آپ کا

لوگوں کے سامنے نماز پڑھ جو رہا ہے تو طویل
خود دلِ کافراں میں ہے اس سے خروش اک بپا

لے کے میں تختِ جم نہ دوں آہِ جگر گداز کو
گرچہ نگاہِ عقل میں عشق ہے چیز کم بہا

کہتا تھا برہمن "یہ ہے میرا چرتر غزنوی
توڑ دیئے بت اور خود داس بنا ایاز کا"

(۷)

یہ ملازمانِ سلطاں کو بتادے کوئی اتنا
کہ نوائے دل گداز اک کرے زیر ایک دنیا

نہ ہو اپنے دھن پہ نازاں کہ بہ شہرِ دردمنداں
ہے تبسمِ ایازی دلِ غزنوی سے مہنگا

دلِ شاہ اس کو دیکھے تو لرز لرز ہی اٹھے
دلِ بے نیاز ایسا ہے گدائے بے نوا کا!

کہ دیا اسے خدا نے یہی نازِ بے نیازی
یہی سازِ بے نوائی ہے متاع اس کی اعلا

یہ بلند و پست رہ کے ، مجھے سب ہیں ایک جیسے
میں طلسمِ دل کا قیدی ، نہ مقام پوچھ میرا

ہے نگاہ پاک تیری ، جو نیاز مند ہے دل
تو رسائی تیری ہوگی ، رہِ عاقلی سے باز آ !

تری چشمِ کم ہے اور تو ، مری جاں سلگتی اور میں
تری راہ میں بھٹکتا ، تری بے رخی کا مارا

وہ نگہہ نشانہ ڈھونڈے ، مرا دل بہانہ ڈھونڈے
کہ نیاز و ناز دونوں ہیں عجب ستیزہ آرا !

رہِ دیر تختۂ گل مرے سجدۂ جبیں سے
کہ دو رکعتوں میں پائے نہ سکوں نیاز میرا

(۸)

ساقیِ لالہ رخ دست بر چنگ ہے
باعثِ خجلت دہِ فنِّ ارژنگ ہے

لالہ خون بہاراں سے مہندی رچائے
یہ دلہن کس قدر تشنۂ رنگ ہے

نغمۂ دل فروز آنکھ پر کھول دے
جس معانی پہ راہِ سخن تنگ ہے

عشق کی آنکھ سے لے سراغ اس کا تو
عقل پر یہ جہاں سحر و نیرنگ ہے

عشق سے سیکھ عمل اور چاہے جو کر
جوہر ہوش وہ جانِ فرہنگ ہے

تیرا میرا فلک سے ہے آگے مقام
سورج اس راہ میں میلِ فرسنگ ہے

خود کو کھویا ہوا قطرہ بے آس تو
بحر میں رہ کے گوہر نہ ہو، ننگ ہے!

قدر اپنی تو کر تجھ سے اس کی بہا
لعلِ رخشندہ تو پارۂ سنگ ہے

(۹)

پوجا پاٹ نہ کی صورت کی، یہ بت خانہ ڈھایا میں نے
میں ہوں سیلِ سبک سیر ایسا، ہر اک بند ڈہایا میں نے

میرے بود و نبود میں اندیشے نے گماں کے پرے جمائے
عشق سے میں ہوں، ہوا ہویدا، عشق سے راز یہ پایا میں نے

دیر میں نازو نیاز ہے میرا اور کعبے میں مری نمازیں
ہاتھ میں اک تسبیح کو تھاما اور زنّار گھمایا میں نے

تیرے درد کے سرمائے کو غارت کرنا ٹھیک نہیں ہے
دل سے جو بھی آنسو امڈا، آنکھوں ہی میں چھپایا میں نے

فرزانہ گفتار سے اپنی اور عمل سے دیوانہ ہوں
مستی میں ہشیار ہوں، ایسا بادۂ شوق چڑھایا میں نے

(۱۰)

گلستاں کو بہاروں نے بنا ڈالا ہے مئے خانہ
سبو غنچے سے ڈھالا اور بنایا گل سے پیمانہ

محبت جب ہوئی کامل، رقابت ہوگئی زایل
فدا ہے شمع پر مل جل کے پروانے سے پروانہ

غضب کا سوز اگر دیکھیں تو ساز زندگی میں ہے
جلا کر پھونک بھی دیتی ہے بیدردانہ، کاشانہ

ہے اس کے سوز میں لیکن بلا کا ساز بھی پنہاں
بدل دیتی ہے کاشانے میں پل کی پل میں ویرانہ

چکوروں کے پروں کے سائے سے بھی وہ لرز اٹھے
قفس میں جب بھی شاہیں ہو چلے منت کشِ دانہ

بس اب اے باغباں اقبالؔ کو گلشن سے رخصت کر
کہ یہ جادو نوا گل سے ہمیں کرتا ہے بیگانہ

(۱۱)

میرا سلام کہیو اس ترکِ تند خو کو
پھونکا نظر سے جس نے اک شہرِ آرزو کو

اک درد مند دل ہی شاید یہ نکتہ سمجھے
گو میں نے کرلی توبہ ، توڑا نہیں سبو کو

اس کی وفا کا قصہ کب تک سناؤں بلبل!
آغوش میں بھرے تو پھر اس رمیدہ بو کو

رمزِ حیات کیا ہے ؟ ہے سوزیا تڑپ ہے
قلزم سے جاکے ملنا ہے ننگ آبجو کو

خوش ہوں کہ عاشقوں کو سوزِ دوام بخشا
درماں نہ کوئی بخشا آزارِ جستجو کو

بولے نہ یوں ورے ہو ، ہٹ دور اب پرے ہو
بخشا نیا بہانہ اشکِ بہانہ جو کو

نالوں سے گلستاں میں آشوبِ حشر اٹھا دے
جب تک کہ دم میں دم ہے ، مت چھوڑ ہائے وہو کو

(۱۲)

ہمارے قصّے سے کانٹے کانٹے کو تونے یاں آشنا کیا ہے
جنوں کے صحرا میں ہم کو پہونچا کے اور رسوا سوا کیا ہے

ہماری تقصیر ایک دانہ ، تو جرم اس کا تھا ایک سجدہ
نہ اس بچارے سے ہی نبھائی ۔ نہ کچھ ہمارا بھلا کیا ہے

اُگے ہیں کشتِ خیال سے میری سو جہاں مثل لالۂ و گل
یہ اک جہاں ! سو بھی کر کے خونِ تمنا آخر یہ کیا کیا ہے

یہ پرتوِ حسن تیرا ابھرا ہوا ہے مانندِ رنگ ہر سو
مثالِ مینائے مئے یہ پردہ عجیب دیوار کا کیا ہے

نئی طرح رکھ کوئی یہاں پر کہ ہم ہیں جدّت پسند تھوڑے
کہ آج اور کل کا تو نے حیرت کدہ یہ کیسا کھڑا کیا ہے

(۱۳)

خوشا کہ رختِ خرد کو جس نے جلادیا شعلہ ہائے مئے سے
مثالِ لالہ اس آگ ہی کو متاع و نقد حیات کرلے

اٹھا اٹھا تو بھی ساغرِ مئے اور اپنے چہرے کو گلستاں کر
بہار نے صوفیوں کو خرقہ فروشی اب تو سکھا ہی دی ہے

مرا فقیہہ حرم کی محرومیوں پہ دل آج کڑھ رہا ہے
کہ پیرِ مئے خانہ اس کے فتوے کے بدلے اپنا نہ جام بیچے

مری نوا ہائے بے اثر سے نہ ہوگی قدرِ سرود کچھ کم
ہے برق نغمہ وہ شئے کہ جس سے متاعِ اسکندری جل اٹھے

صبا ذرا گلستانِ ویمر[۱] میں جا کے میرا سلام کہنا
کہ خاک اس کی ہے وہ کہ روشن ہے چشم نکتہ وراں اسی سے

---

[۱] ویمر (جرمنی) جہاں گوئٹے کا مدفن واقع ہے (مترجم)

(۱۴)

اٹھا ساغر کہ اب گردش فلک کی حسبِ مرضی ہے
مثالِ غنچہ گلشن میں نوا شاخوں میں اگتی ہے

پیوں شیخِ حرم کی میں تنک نوشی کو کرکے یاد!
کہ جس نے پی تو اپنے رازداں کے ساتھ ہی پی ہے

بڑھے اس کا قبیلہ جو یہ حرفِ پختہ کہتا ہے
چراغ امید ہی کا شمعِ راہِ زندگانی ہے

غزل میں نے وہاں چھیڑی جہاں سنتا نہیں کوئی
نوایہ، دوستوں کے حوصلے سے، میری اونچی ہے

عیارِ معرفت ہے مشتری کی، یہ سخن سنجی
متاعِ کس مسخر ٹھہری۔ خوشی مجھ کو اسی کی ہے

یہ شعرِ دل کشِ اقبالؔ سے ثابت ہوا آخر
کہ درسِ فلسفہ دیتے ہوئے بھی عاشقی کی ہے

(۱۵)

آرزو مجھ کو ہے شمشیر و سنان و تیر کی
ساتھ مت آ! دُھن ہے مجھ کو مسلکِ شبیرؑ کی

کر رہا ہوں جمع تنکے آشیانے کے لیئے
اور تمنا ہے شرارہ ہائے آتش گیر کی

کہہ رہے ہیں فاش مت کر راز میرے ، ہونٹ سی
میں کہوں ، ہے آرزو بس نعرۂ تکبیر کی

کہہ رہے ہیں ، جو بھی تیرے دل میں ہے وہ کر طلب
بے حجابی چاہتا ہوں میں فقط تقدیر کی

اس قدر ہی جانتا ہوں میں تو اپنا روزگار
بھول بیٹھا خواب لیکن دُھن لگی تعبیر کی

وہ نگاہ ناز جس نے دل اڑایا ، ہے کہاں
لمبی اس کی عمر ہو ! حسرت ہے اس کے تیر کی !

(۱۶)

لے سبحہ ہاتھ میں اور زنّار باندھنا سیکھ
تیری نظر دوبیں ہے تو پھر نہ دیکھنا سیکھ

مثلِ شمیم باہر آ ! گل کی خلوتوں سے
موجِ صبا کے ہمرہ گلشن میں گھومنا سیکھ

شبنم کا ایک قطرہ بے مایہ ہے اگر تو
اٹھ ! اور داغ دل پر لالے کے بیٹھنا سیکھ

تو گل کے ساتھ کوئی کانٹا اگر بنا ہے
عزت چمن کی رکھ لے ! یونہی گزارنا سیکھ !

گر باغباں چمن سے تجھ کو اکھاڑ پھینکے
سبزے کی طرح پھر سے سر کو ابھارنا سیکھ

ہو تاکہ تو شراب سوزندہ ، تلخ تر بھی
عزلت میں خم کدے کی خود کو نکھارنا سیکھ

کیا دوسرے کے بل پر یہ اڑنا ، پھڑپھڑانا
گلزار کی ہوا میں آزاد گھومنا سیکھ

بت خانہ کھٹکھٹایا تو مغ بچے یہ بولے
تپ کر حرم کے اندر شعلے ابھارنا سیکھ !

(۱۷)

ہے تیری خاک میں جو گم طلب وہ آگ بجھی کر !
نہیں تقاضے کے قابل تجلیِ دیگر

رکھے نہ جان ہتھیلی پہ جو ، وہ ہم سے نہیں
نہ دوں یہ مصرع نظیری کا ، ملکِ جم لے کر

تو دل گرفتہ نہ ہونا کہ عشق اکیلا نہیں
اگرچہ عقل فسوں پیشہ لائی ہے لشکر

تو رہ شناس نہیں ، بربطِ سلیمیٰ میں
ہر ایک نغمہ ہے ، تجھ کو نہیں ہے اس کی خبر

جہاں میں پھیل گئے جلوہ ہائے دوست مگر
میں خود کو دیکھ رہا ہوں ، ہٹاؤں کیسے نظر

اب آکہ غلغلہ اک شہر دلبراں میں اٹھائیں
جنوں ہمارا نہیں ہرزہ گردِ دشت و در

سنا حکایتِ صیدِ نہنگ اور نہ کہہ
نہیں سفینۂ مرا روشناس بحر ، مگر !

غلام اس کا ہوں میں ، جس نے وہ سفر نہ کیا
کہ جس سفر میں نہیں کوہ و دشت و بحروبر

شریکِ حلقۂ رندان بادہ پیما ہو ——— !
جو مرد غوغا نہیں اس سے اے عزیز حذر !

برہنہ حرف نہ کہنا ہے گفتگو کا کمال
مدار خلوتیوں کا ہے رمز و ایما پر

(۱۸)

موج کو بھی اک دریا کے سینے سے نکالا جاسکتا ہے
بحرِ بے پایاں کو ندی میں اپنی باندھا جاسکتا ہے

سوزِ نوا سے شہرِ دل میں خون کی ندیاں بہہ سکتی ہیں
موجِ نسیم سے ایک " چمن گل " ، سینہ چیرا جاسکتا ہے

سدھی ہوئی چڑیا کی طرح جبریل کو بس میں کر سکتے ہیں
جلے ہوئے اک بال سے اس کا شہپر باندھا جاسکتا ہے

جامِ جم سے نازک تر ہے کارِ سلطنت اے اسکندر!
ایک " جہاں آئینہ " اک پتھر سے توڑا جاسکتا ہے!

تو ہو اگر محکم تو سیلِ بلا انگیز نہیں ہے کچھ بھی
مثلِ گوہر دریا کے دل میں بھی بیٹھا جاسکتا ہے

میں ہوں فقیر بے نیاز اک، میرا مشرب ہے بس اتنا
مومیائی تو نہیں ہے ممکن، لیکن ٹوٹا جاسکتا ہے

(۱۹)

تو نالۂ شب گیر کہ تو صبح بلا خیز
تو آہِ شرر ریز اور اک شعرِ دل آویز

کیا فرق ہے، معلوم ہے کچھ عشق و ہوس میں؟
وہ تیشۂ فرہاد ہے یہ حیلۂ پرویز

کہہ دو کوئی ان پردگیوں سے، مری مٹی
اک گردِ نظر باز ہے، اک خاکِ بلاخیز

سرمست کرے مجھ کو، مرے ہوش اڑائے
مرغانِ سحر خیز کی گلبانگِ دل آویز

ڈرتا ہوں نہ پھر خاکِ سمرقند سے اٹھے
آشوبِ بلاکو، کوئی ہنگامۂ چنگیز

مطرب کوئی رومیؔ کی غزل چھیڑ، کوئی شعر ـــ!
تا حلقے میں لے جاں کو مری آتشِ تبریز ـــ!

(۲۰)

چشمِ کرشمہ ساز کو سرمے سے کر جگر جگر
شوقِ غزل سرائی کا ذوقِ جنوں دوچند کر

خاک کا پتلا ڈھالنا، زیب ذرا تجھے نہ دے
نقش اک اور اے خدا، آدم اک اور پختہ تر

لذتِ ہائے ہائے کا خلوتیو! کروں میں کیا
کہنے کا دردِ دل نہیں، دردِ جگر حجاب اثر

آہِ درونہ تاب لاؤ، اشکِ جگر گداز لاؤ
عقلِ گرہ کشا کا جام توڑ رہا ہوں سنگ پر

جام اٹھا، غزل سنا، بندِ قبا کے کھول دے
زخمے سے تارِ چنگ چھیڑ، باغ میں چل کے خیمہ کر

صبح ہوئی تو کارواں پڑھ کے نماز چل پڑا
زمزمۂ درا ابھی تو نے سنا نہیں مگر!

نازِ شہاں اٹھاؤں میں؟ زخمِ کرم نہ کھاؤں میں!
دیکھ تو اے ہوس فریب! کر مرے جوہر پہ نظر!

(۲۱)

عقلِ مکرباز کا انداز دیدنی ہے
کرتی ہے میرِ قافلہ ہوکر بھی رہزنی

رکھ عقلِ حیلہ گر سے نہ امید رہنمائی
آ ! عشقِ باکمال ہے اور وہ بھی یک فنی

کرتا ہے گو فرنگ ستاروں سے گفتگو
بچ کر نکل کہ اس کا ہے شیوہ ہی جوزنی

کیا اس سرائے کہنہ میں ہو ذکرِ مرگ و زیست
ہے زیست ایک کاہشِ جاں ۔ مرگ جاں کنی

پل بھر سرِ مزار شہیداں پہ بھی ٹھہر
اس خامشی میں بھی ہے نہاں حرف گفتنی

دشتِ عرب کی راہ پکڑ ، چھوڑ عجم کی بزم
فرسودہ اس کی مئے ہے تو ساغر شکستنی

اقبالؔ شیخ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش
اک رہ نشیں فقیر ہے ، دل کا مگر غنی !

(۲۲)

حسرت ہے مجھ کو جلوۂ ماہ تمام کی
سینے پہ ہاتھ اور نظر بام پر مری — !

کہتا ہے حسن ، شام نہیں میری صبح کی
اور عشق کو ملی ہے تب و تابِ دائمی

امروز میں ہوں قید نہ فردا نہ دوش میں
پست و بلند ہے نہ اسیری مقام کی

رازوں بھری شراب ہوں، ہے کوئی میگسار؟
گردش شراب خانے میں جاری ہے جام کی

لاہوتی اس نوا سے نہ جا بن کے بے نیاز
پیغامِ دوست رکھتا ہوں اک اپنے پاس بھی

ہوں پردہ در، پہ رکھتا ہوں پردہ سخن کا میں
ہے تیغِ خوں فشاں مری زینت نیام کی

(۲۳)

ہماری شاخِ زندگی میں تشنگی سے ہے نمی
دلیلِ ناتمامی ہے، تلاش آبِ خضر کی

حدیثِ دل کسے سناؤں؟ کون راہ جاؤں میں؟
کہ آہ ہے تو بے اثر۔ نظر؟ ادب سے دشمنی

غزل سرا تو ہو مگر سُروں کو اپنے پست رکھ
کہ نالۂ طیور ہے نوائے زیر لب ابھی

حجاز والے لے اڑے متاع قافلہ اگر
تو تم زباں نہ کھولنا کہ ہیں تو پھر وہ اپنے ہی!

ظہورِ مصطفائیؐ کو بنا بہانہ بولہب
ہے شاخِ ترک، برق سے فرنگ کی ہری بھری

عجم کی محک پر پرکھ ، نہ رکھ، عیارِ ہند پر
کہ گریہ ہائے نیم شب کی دین ہے یہ شاعری

کشید کی ہوئی ہے یہ تو خم سے پیرِ رومؔ کے
کہ بادۂ عنب سے تیز ہے مئے سخن مری!

(۲۴)

عاشق کے لئے ہے اک ، کعبہ ہو کہ بت خانہ
یہ جلوتِ جانانہ ، وہ خلوتِ جانانہ

خوش ہوں کہ مرا مرقد یاں کوئے حرم میں ہے
پلکوں سے بناؤں گا رہ اب سوئے بت خانہ

سو بزم جہاں کیا شئے؟ یہ حور و جناں کیا ہے
اک ہمدمِ فرزانہ دو بادۂ و پیمانہ

ہر اک کی نظر اپنی ، ہر اک کی زباں اپنی
اٹھا تری محفل میں افسانے سے افسانہ

شب خونِ دلوں پر یوں کس شخص نے مارا ہے
صد شہرِ تمنا پر یہ حملۂ ترکانہ

اس دشت جنوں میں تو جبریل ہے پہلے ہی
اک صیدِ زبوں میرا ، اے ہمدمِ فرزانہ

یزداں پہ کمند اپنی اب پھینک رہا ہوں میں
اے ہمتِ مردانہ ، اے ہمتِ مردانہ!

اقبال نے کہہ ڈالے سب راز نہ کہنے کے
مئے خانے سے نکلا ہے ناپختہ یہ دیوانہ

(۲۵)

تیرے بغیر تو خواب عدم سے باہر آنا ، ناممکن ہے
تیرے ساتھ نہ جینا یعنی تجھ بن جینا ، ناممکن ہے

دل میں ہمارے ہے یہ جہاں یا جہاں میں یہ دل کھویا سا ہے
لب سی بیٹھو ! یہ پیچیدہ گتھی کھلنا ، ناممکن ہے

دل یاروں کے میری نوائے پریشاں سے ہیں سوزاں سوزاں
لیکن میں اس گیت سے تپتا ہوں کہ سنانا ، ناممکن ہے

بادِ صبا ! اس تیری تنک افشانیِ شبنم سے کیا ہوگا
تاب و تب لالے کے جگر کی ٹھنڈی ہونا ناممکن ہے

دل کو حق سے باندھ ، کشاد اپنی نہ طلب کر شاہوں سے تو
یعنی اس بت خانے کے در پر سر کو جھکانا ، ناممکن ہے

(۲۶)

یہ گنبدِ مینائی یہ پستی و بالائی ـــــ !
گم ہیں دلِ عاشق میں ، باایں ہمہ پہنائی

اسرارِ ازل ڈھونڈے؟ ڈال ایک نظر خود پر
یکتائی و بسیاری ، پنہائی و پیدائی

اے جانِ حزیں دیکھا کیا چیز محبت ہے
سینے میں نہ چین آیا ، آنکھوں سے نکل آئی

اٹھ! بادِ بہاراں نے کی مشعلِ گل روشن
کر لالۂ صحرائی سے کچھ تو شناسائی

عشق اور ہزار افسوں ، حسن اور ہزار آئیں
گنتی میں نہ تو آئے ، گنتی نہ مری آئی

ہے اوجِ ثریا بھی ، اور قعرِ مذلت بھی
خاقانی و فغفوری ، جمشیدی و دارائی

(۲۷)

(ایک صوفی کے نام)

ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو رکھے ہے نہ میں
جگرِ گرمیِ صحرا نہ تو رکھے ہے نہ میں

پیرِ مے خانہ ہے تو اور جواں ساقی میں
بزم ہے تشنہ کہ صہبا نہ تو رکھے ہے نہ میں

دل ودیں لوٹ چکے زہرہ و شانِ عجمی
آتشِ شوقِ سلمیٰ نہ تو رکھّے ہے نہ میں

صرف چنتے تھے صدف ساحلِ دریا پر ہم
دانۂ گوہرِ یکتا نہ تو رکھّے ہے نہ میں

چھوڑ اب یوسفِ گم گشتہ کی کیا بات کریں
تپشِ خونِ زلیخا نہ تو رکھّے ہے نہ میں

آ چراغِ تہہِ داماں ہی سے اب ساز کریں
طاقتِ جلوۂ سینا نہ تو رکھّے ہے نہ میں

(۲۸)

میں منزل آشنا ہوں ، تھام دامن میرا دیوانے
شرارِ شوق مجھ سے لے کر اپنی خاک میں رکھ لے !

عروسِ لالہ نکلی ہے سرائے ناز سے باہر
تری جاں پھونک دوں میں حرفِ شوق انگیز سے اپنے !

غمِ فرہاد کا یا عشرتِ پرویز کا قصہ
کہا جاتا ہے ہر اک دور میں اسلوبِ تازہ سے

اگرچہ کافرِ ہندی ہوں ، میری آنکھ روشن ہے
بخارا ، کابل اور تبریز کی خاکِ مقدس سے

(۲۹)

رونا ہمارا بے اثر ، نالے ہمارے نارسا
حاصل ہے سوزوساز کا بس اک دلِ خونیں نوا

دیکھی جو اس دل کی تڑپ ، دیر و حرم پیدا کئیے
اس کی تمنا ہے مجھے ، محوِ تماشا وہ مرا

ہیں پردہ داراں بے حجاب ، اپنی خودی میں غرق میں
اور عشقِ غیرت مند کو میلِ تماشا لاپتہ

مطرب نے مئے خانے میں کل کیا خوب نکتہ کہہ دیا
گو مئے حشی ہے اک خطا ، ہے مئے کشی تاہم روا

سب رہرووں کی زندگی کیا ہے فقط جہدو عمل
اس قافلے کو موج کے ، جادہ کہاں ، منزل کجا

میری خس و خاشاک میں بھڑکا کے شعلے رکھ دئیے
رومیؔ نے جب یہ کہہ دیا - منزل ہماری کبریا !

(۳۰)

ہماری دنیائے دل میں پیدا تو کوئی دورِ قمر نہیں ہے
ہے ہردم اک انقلاب لیکن وہاں یہ شام و سحر نہیں ہے

مجھے ہے دکھ ایسے قافلے کا کہ جس نے دوں ہمتی سے اپنی
طلب کی اک رہ گزار ایسی کہ جس میں کوئی خطر نہیں ہے

خرد سے دامن کشاں ہو اور بحر عشق کی موج میں ہو غلطاں
کہ اس تنک مایہ آبجو میں نہیں ہے کوئی گہر نہیں ہے

جو تیرے میرے خیال کی پے بہ پے تگ و تاز کا ہے مقصود
وہ آنکھ میں ہے مگر ہویدا کہیں مثالِ نظر نہیں ہے

(۳۱)

ہے سوزِ سخن نالۂ مستانۂ دل سے
یہ شمع ہے روشن اسی پروانۂ دل سے

اک مشتِ گل اور ذوقِ فغاں؟ یہ نہیں ممکن
غوغا ہے یہ سب گردشِ پیمانۂ دل سے

سیارہ یہ تاریک جہاں نام ہے جس کا
فرسودہ یہ پیکر ہے صنم خانۂ دل سے

تکتا ہے ستارے جو رصدگاہ میں بیٹھا
کچھ دور نہیں سرحدِ ویرانۂ دل سے

افلاک کے نوری ہیں اسیر اس کی نظر کے
صوفی ہے فنا شیوۂ ترکانۂ دل سے

محمود ہوا، ڈھایا صنم خانوں کو جس نے
سجادِ بتاں فیضِ صنم خانۂ دل سے

غافل کوئی ایسا بھی مسلمان نہ ہوگا
دل رکھ کے ہو، منجملۂ بیگانۂ دل سے

(۳۲)

سطوت کوہ سے لے کر برگِ کاہ کو بخشا کرتے ہیں
جمشیدوں کے تاج گدائے راہ کو بخشا کرتے ہیں

عشق کی راہ میں کوئی فلاں اور ابن فلاں کچھ چیز نہیں
موسیٰ کا ید بیضا مردِ سیاہ کو بخشا کرتے ہیں

تختِ شاہ کبھی سلطاں کے لختِ جگر کو بھی نہیں ملتا
کبھی یہ ہوتا ہے، زندانیِ چاہ کو بخشا کرتے ہیں

فقر کو ہو جاتی ہے جہاں بانی و جہاں گیری بھی عطا
تیغِ نگاہ اک ایسی گدائے راہ کو بخشا کرتے ہیں

عشق ہوا پامال خرد اور جہاں دگرگوں ایسے میں
رخصت آہ کی مجھ سے فقیرِ راہ کو بخشا کرتے ہیں

(۳۳)

حرم میں تو سمائے نے سوئے بت خانہ آتا ہے
پہ مشتاقوں کے دل میں کیا ہی مشتاقانہ آتا ہے

حریم جان مشتاقاں میں آجا ! بے جھجک آجا !
تو صاحب خانہ ہے آخر یہ کیوں دزدانہ آتا ہے

کبھی کرتا ہے غارت دولتیں تسبیح خوانوں کی
کبھی زنّاریوں کو لوٹنے ترکانہ آتا ہے

بہاتا ہے کبھی اپنوں کا خوں لشکر کشی کر کے
کبھی محفل میں لے کر شیشہ و پیمانہ آتا ہے

کبھی تو نخلِ سینا کو جلائے بے محابانہ
کبھی شمعِ یتیماں پر تو ، بن پروانہ آتا ہے

ادھر آ ! اک خمستان خودی سے جام بھر اقبالؔ
کہ تو مغرب سے اپنے آپ سے بیگانہ آتا ہے

(۳۴)

چمک دمک بتکدۂ عجم کی پہونچے نہ سوزوگداز کو میرے
ایک نگاہِ محمدِ عربی چھین چکی ہے حجاز کو میرے

عقلِ بہانہ جو ، میں کروں کیا ، لگائے ہر دم گرہ گرہ پر
ایک نگاہ ! کہ گردش چشم یہ ڈھائے طلسمِ مجاز کو میرے

میرے دلِ زندہ کی تپش تک پہونچے خرد کی فسوں گری کیا
درسِ فلسفہ چھوڑ ! اپنالے مسلکِ سوزوگداز کو میرے

(۳۵)

مثلِ آئینہ نہ ہو محوِ جمال اوروں کا
دیدۂ دل سے مٹا ڈال! خیال اوروں کا

پھونک دے آتشِ مرغانِ حرم سے اس کو
آشیانہ کہ جو تیرا ہے، نہال اوروں کا

تجھ کو اڑنا ہے تو پھر اپنے پر و بال سے اڑ
اڑنا ممکن نہیں گر ہو پروبال اوروں کا

مرد آزاد ہوں میں اور ہوں غیورؔ اتنا
مر ہی جاؤں جو ملے جامِ زلال اوروں کا

تو کہ ہے جاں سے بھی نزدیک پہ نظروں سے نہاں
ہجر پیارا ترا، چاہوں نہ وصال اوروں کا

(۳۶)

جہانِ عشق نہ میری نہ سروری جانے
یہی بہت ہے کہ آئینِ چاکری جانے

نہیں ضرور جو پہنے جنئیو، پھیرے لگائے
صنم پرستی و آدابِ کافری جانے

یہاں ہیں خیبرو اژدر بہت، ضرور نہیں
کہ جو بھی نانِ جویں کھائے حیدری جانے

ہے چشمِ اہلِ نظر میں بڑا سکندر سے
گدائے رہ جو مآلِ سکندری جانے

اسی سے مل کہ حسیں تر ہے خوب رویوں سے
وہ مردِ پیر جو آئینِ دلبری جانے

فرنگ شیشہ گری کرکے ڈھالے ساغر و جام
مزہ یہ ہے کہ وہ شیشے ہی کو پری جانے

فسانہ یہ ہے مسلمان نا مسلماں کا
کہ ہے وہ پورِ خلیلؑ اور آذری جانے

کبھی ہو تیرا گذر میرے غم کدے سے تو دیکھ!
ستارہ سوختہ یہ ، کیمیا گری جانے

کبھی تو مجلسِ اقبالؔ میں بھی بیٹھ کے پی!
اگرچہ سر نہ تراشے ، قلندری جانے

(۳۷)

ہر خواجہ ہے بندے کی طرح اس کا پرستار
ہر بندہ ہے خواجہ کی طرح اس کا خریدار

واعظ کا بیاں طور و تجلی سے ہے معمور
جلوے سے تہی اس کا ہے آئینہ گفتار

پیر اپنے کریں مصلحتاً عشق مجازی
ان زہرہ وشوں سے نہیں کچھ ان کو سروکار !

کر خرقہ فروشوں سے حذر، اس سے لگا دل
یوں سہل وہ پھنسنے کا نہیں آہوئے تاتار

بربط سے نہ کر میرے طلب نغمۂ راحت
چھیڑوں میں وہ سُر کیسے جو رکھتا نہیں یہ تار

گو دل نے تو کی برہمنی، قشقہ بھی کھینچا
لیکن نہیں اک آن بھی شائستۂ زنّار

میخانے کی صحبت میں زباں عشق نے کھولی
اک، دیر و حرم میں نہ ملا محرمِ اسرار

(۳۸)

خوشا ! کہ بلبلِ شوریدہ سر ہے نغمہ طراز
عروس لالہ دکھانے لگی کرشمہ و ناز !

نوا کی اصل حقیقت میں ہے تو پردۂ غیب
نہ تو گلوئے غزل خواں سے ہے نہ پردۂ ساز

وہ شخص جس نے کہ ساز حیات کو چھیڑا
مری نگاہ میں بندہ وہی ہے محرمِ راز

مجھے تو پردگیانِ جہاں کی سب ہے خبر
مگر زبان نہ کھولوں کہ چرخ ہے کج باز !

سخن درشت نہ کر ، راہِ دوستی اپنا
یہ مل کے بیٹھنا اپنا ہے صرف مولا ساز

بتاؤ ہے کوئی منزل جہان تیرہ کی
کہ مثلِ ریگِ رواں سب ہے مائل پرواز

یہ میرا تن ہے کہ گل باغ کاشمر کا ہے
حجاز سے ہے مرا دل تو ہے نوا شیراز - !

(۳۹)

ہیں خاک و تند سیر مثالِ ستارہ ہم
اس نیلے یم میں محوِ تلاشِ کنارہ ہم

اک شعلۂ حیات سے یہ ہست و بود سب
اور لذتِ خودی سے مگر پارہ پارہ ہم

عقلِ بلند دست کے ہاتھوں سے نوریو !
ہیں خاکیانِ دوشِ ثریا سوارہ ہم

ہیں عشق میں وہ غنچہ کہ لرزے نسیم سے
اور جہدِ زندگی میں مگر سنگ خارہ ہم

نرگس کی طرح ہم نے بھی کھولی ہے اپنی آنکھ
روبند کھول دے ، ہیں سراپا نظارہ ہم

(۴۰)

میرے سرشک خوں سے عرب ایکِ لالہ زار
عجمِ رمیدہ بو ، کو ہو میرا نفَس بہار

سوز و تپش ہی زیست ہے اور زیست بھی دوام
ہر ذرہ میری خاک کا اک دل ہو بے قرار

منزل پہ ہے قرار نہ رستے میں تجھ کو چین
اے دل! کہ ہے سفر میں، خدا ہی ہو تیرا یار

اک نقش نامرادی بنائے سدا خرد
دل ساز وہ اٹھائے شکستہ ہوں جس کے تار

میرا سخن ہے سوز تمام اور تو ہے خام
میری غزل سرائی یہ ہو ، تجھ کو سازگار

گہرائیوں سے دل کی ، یہ ہے میری آرزو
شبنم تری بنے کبھی دریائے بے کنار

تیرے نصیب میں نہ ہو اک پل کو بھی قرار
تاب و تبِ حیات بھی ہو تجھ پہ آشکار

(۴۱)

ہمہ تقصیر نظر تیری ، خرد کوتاہی
تجھ کو پہونچائیگی منزل پہ کلیم اللہی

راہ تاریک ہے ، ڈوب آپ میں اے سالکِ رہ!
راستہ گم نہیں کرتی تہہِ دریا ماہی!

میروشہ سے کرے حاجت نہ طلب مردِ غیور
کوہساروں سے بھلا کیسے ہو ممکن کاہی

نغمۂ شوق مرا سن کہ ملیں گے اس میں
رمز درویشی و سرمایۂ شاہنشاہی

ہے نفس میرا تجھے ، گل کے لئے جیسے نسیم
لذتِ آہِ سحر سے ہو اگر آگاہی

اے فلک! آنکھ ابھی بیباک و بلا جو ہے تری
پھر تماشہ تو کیا چاہتا ہے اے واہی؟

(۴۲)

شراب سے تیری مست و بے خود نہیں کہ اک خم شکن نہیں ہے
نہیں کہ تیرے لبوں سے سرشار کوئی شیریں سخن نہیں ہے

نگاہ میں کھب رہی ہے ہر چند یہ قبائے عرب بھی تجھ پر
نہ ہو جو قامت پہ راست تیرے وہ ایک بھی پیرہن نہیں ہے

یہ لعلِ لب تیرے گرچہ چپ ہیں مگر ہے تیری نظر تو گویا
مرے دل خوں شدہ سے ہردم نہ ہو جو محوِ سخن نہیں ہے

فقط ترے ذکر ہی کی خاطر سجائی ہے انجمن یہ میں نے
وگرنہ خلوت کدے میں میرے نہیں کہ اک انجمن نہیں ہے

طلاقتِ معجزِ سلیماں ذرا تو ، پھر سیکھ ! اے مسلماں !
کہ تیرے خاتم پہ دیکھتا ہوں نہیں کہ اک اہرمن نہیں ہے

(۴۳)

اگرچہ سر پہ کوئی افسر و کلاہ نہیں
گدائے کوچہ ترا کم زِ پادشاہ نہیں

جوان نیند میں ہیں اور مردہ دل سب پیر
نصیبِ سینہ کہیں آہِ صبح گاہ نہیں

اسی بہانے سے دشتِ طلب سے پانو نہ کھینچ
کہ تیرے دور میں اک آشنائے راہ نہیں

تو اپنے وقت سے غافل نہ بیٹھ ، ڈھونڈ کے لا
وہ وقت جس میں حسابات سال و ماہ نہیں

امید عافیت اس دیر کہنہ میں ہے تجھے ؟
کہ تیری کشمکشِ زیست پر نگاہ نہیں !

گناہ میرے لکھے جائیں کاتبانِ عمل
نصیب میرا یہاں کچھ بہ جز نگاہ نہیں

اب آکہ دامنِ اقبال تھام لیں چل کر
کہ وہ زِ خرقہ فروشانِ خانقاہ نہیں

(۴۴)

شعلہ در آغوش ہے یہ عشقِ بے پروا مرا
اک شرر رکھتا نہیں ، ہے فلسفہ نازا مرا

ہو چلے کامل تو یکسر ناز ہی ٹھہرے نیاز
قیس کا ہے نام لیلیٰ ، وہ ہے یہ صحرا مرا

لایا ہوں ہندوستاں سے میں تری دہلیز پر
جو جبیں میں ہوگیا خوں، سجدہ اک ایسا مرا

تیغ لا اس کافر دیرینہ کے ہاتھوں میں دے
دیکھ پھر اس دہر میں ہنگامۂ الاّ مرا

کیا عجب گردوں ضمیرِ روزگاراں سے کبھی
دوش سے میرے منوّر پھر کرے فردا مرا

ہے سپہرِ بارگہ سے تیرے ، عالم مستنیر
اور نہیں شایان شاں تو کیا فقط سینا مرا

بات پردے میں خدا سے ہے تو تجھ سے آشکار !
یا رسول اللہؐ ! وہ پنہاں ہے ، تو پیدا مرا

- بانجھ

(۴۵)

ہردم نئے بتوں کو تراشے ! خدا بچائے !!
لیکن نہ اپنے آپ میں ڈوبے ! خدا بچائے !!

یوں گرمیِ فرنگ سے پگھلائے آپ کو
بہ ، آپ اپنی آنکھ سے ، نکلے ! خدا بچائے

جس کوچے کی ہے خاک . بھی زر واں تجھے کوئی
اک نیم غمزے میں نہ خریدے ! خدا بچائے !!

مانا پڑھی کتاب خرد ، خوب ہی پڑھی
لیکن حدیثِ شوق نہ سمجھے ! خدا بچائے !!

کرکے طوافِ کعبہ ، پھرے گردِ دیر بھی
خود پر مگر نگاہ نہ ڈالے ! خدا بچائے !!

○

نقشِ فرنگ

نقشِ فرنگ

پیام

کہہ دے جاکر دانائے افرنگ سے آج اے بادِ صبا !
عقل کے جتنے پر کھلتے ہیں ہوجاتی ہے اتنی اسیر

برق یہ اپنے جگر میں سموئے اور وہ اس کو رام کرے
عشق ہے عقلِ فسوں پیشہ سے بڑھ کے جگر دار و خودگیر

آنکھ تو دیکھا کرتی ہے باہر سے رنگِ لالۂ و گل
پردۂ رنگ میں ہے جو کچھ ہے، جو ہنیں اس پہ ظہور پذیر

حیرت کی کیا بات ہے تجھ کو ملا اگر اعجازِ مسیح
حیرت تو یہ ہے کہ ترا بیمار ہے اور بھی کچھ دل گیر

دانش کا اندوختہ رکھتا ہے، دل ہارے بیٹھا ہے
آہ ! یہ کیسا نقدِ گراں مایہ تو گنوائے بیٹھا ہے

فلسفۂ و حکمت کا کوئی انت ہنیں ہے۔ یہ سچ ہے
لیکن سیلِ عشق و محبت ان کے مکتبِ فن میں ہنیں

اہلِ دل کی راہ میں بن کر بیٹھے ہوئے ہیں یہ رہزن
کونسا ہے وہ فتنہ جو ان کی چشمِ پُرفن میں ہنیں

ان کی ٹھنڈی آگ سے دل کو کوئی گرمی کیا پہونچے
لذت کوئی ان کی خلش غمزہ کے دامن میں نہیں

صحرا و کہسار تو چھانے پر نہ کیا صید ایک غزال
چمن چمن بھی گھومے لیکن اک گل بھی دامن میں نہیں

چارۂ کار یہی ہے اب تو عشق سے چاہیں اپنی کشاد
اسی کے آگے سجدہ گذاریں ، اسی سے مانگیں اپنی مراد

عقل جب اپنے قدم بڑھائے اس راہِ خم در خم میں
پانی میں شعلے دوڑائے اور کرے یہ جہاں برہم

ریگِ رواں کو اس کی کیمیا سازی نے زر میں ڈھالا
جلے ہوئے دل پر اکسیرِ محبت رکھّی پر کم کم!

ہائے ہماری سادہ دلی ہم ہوگئے اس کے فسوں خوردہ
بیٹھ کر اس رہزن نے کمیں میں کھوٹی کی راہِ آدم

اس کے ہنر نے خاک سمیٹی ہتذیبِ افرنگی سے
اور اس خاک سے آلودہ کردی چشمِ ابنِ مریمؑ!

شرارے بو کر ، شعلوں کی اک فصل اگانا! یہ کب تک؟
پہلے دل میں گرہ ڈالنا' کھولے جانا! یہ کب تک؟

عقل خود بیں اور ہی کچھ ہے ، عقل جہاں بیں ہے کچھ اور
بلبل کا پر اور ہی کچھ ہے ، بازوئے شاہیں ہے کچھ اور

پڑے ہوئے ہوں خاک میں دانے۔ ان کا چننا بھی ہے کچھ
اور غذا ہو جس کی فلک پر دانۂ پرویں، ہے کچھ اور

مثل نسیم جو سیر چمن کی کرتا ہے، ہے اور کوئی
اور وہ جو پہونچے بہ ضمیر غنچہ و نسریں ہے کچھ اور

پردۂ نُہ افلاک اٹھانا اپنی نظر سے بات ہے ایک
رہ جائے جو ہوکر رہن ظنّ و تخمیں ہے کچھ اور

خوشا وہ عقل کہ دو عالم کی پہنائی ہے جس کے ساتھ
نور فرشتہ اور آدم کا سوزِ دل ہے جس کے ہاتھ

ہم کہ نکل آئے ہیں باہر عشق کے خلوت خانے سے
خاک پا کو ہم نے آئینے کی طرح چمکایا ہے

دیکھ ہماری ہمت ہم نے لگادیا ہے داؤں پر
دونوں جہاں کو کھوکے بہ ظاہر اور بہ باطن پایا ہے

ہمارے آگے رواں دواں ہیں سلسلہ ہائے شام و سحر
جوئے رواں کے کنارے ہم نے خیمہ اپنا لگایا ہے

دل میں ہمارے، جس نے شبخوں دیر کہن پر مارا ہے
ایسی آگ بھری ہے جس نے خشک و تر کو جلایا ہے

ہم کہ کبھی شعلہ تھے۔ ٹوٹے اور شراک بن بیٹھے
صاحب ذوق و تمنا بن گئے اور نظر اک بن بیٹھے

عشق نے پیشہ ہوس کا جب اپنایا توڑے سارے بند
آدم اس کے فتنے سے ، مچھلی جیسے پھندے میں پھنسے

بزم سے ہو کے کنارہ کش ، کی رزم آرائی ، فوج بنائی
اپنوں ہی کے سینۂ و گردن پر اس کی شمشیر پڑے

راہزنی کی رکھّی بِنا اور نام جہاں بانی کا دیا
سرمایہ داروں کے ستم سے کمزوروں کی کمر ٹوٹے

بے شرمی کے ساتھ ہے جاری شورِ رقص و رامش و رنگ
اپنے عزیزوں ہی کے خوں سے اپنے خالی جام بھرے

آکہ یہی ہے وقت کہ مل کر ایک نیا آئین بنائیں
پاک کریں لوحِ دل دھو کر ، نئے سرے سے آگے آئیں

سر سے تاج گرے شاہوں کے ، شورشِ یغمائی رخصت
ٹوٹ گئی نَے اسکندر کی ، نغمۂ دارائی رخصت

کوہکن آیا تیشہ بدست اور طلب کرے ہے پرویزی
سرمایہ داروں کی عشرت ، محنتِ لالائی رخصت

یوسفِ کنعاں قید سے چھوٹ کے بن بیٹھا ہے عزیزِ مصر
سارے فسانے ختم ہوئے ، افسونِ زلیخائی رخصت

راز تھے جتنے پوشیدہ سب فاش ہوئے بازاروں میں
سحر سخن سازی کا ٹوٹا ، انجمن آرائی رخصت

آنکھیں کھول اگر تیری آنکھوں میں نظر کچھ دیکھے ہے
زندگی ایک نئی ہی دنیا کی تعمیر کے درپے ہے

میں تو آج اس خاکِ کہن میں گوہرِ جاں کو دیکھتا ہوں
ہر ذرّے میں انجم ساں چشمِ نگراں کو دیکھتا ہوں

دانہ جو آغوشِ زمیں میں کرتا ہے آرام ابھی
اس میں پھلتے پھولتے پورے نخلِ جواں کو دیکھتا ہوں

کوہ کو دیکھ رہا ہوں سبک میں گھاس کے تنکے کے مانند
گھاس کے اک تنکے میں شکوہِ کوہ گراں کو دیکھتا ہوں

اتھل پتھل ایسی نہ سما پائے جو ضمیرِ گردوں میں - !
یہ تو نہیں معلوم کہ میں کیسے اس عیاں کو دیکھتا ہوں

خوش قسمت ہے جو اس گرد میں کوئی سوار آتا دیکھے
تار کی جنبش کے اندر نغمے کو برماتا دیکھے

زیست تو ہے اک بہتی ندیا، رواں رہے گی، رہی رواں
یہ مئے کہنہ سدا جواں ہے، جواں رہے گی، رہی جواں

جس کو نہیں ہونا ہے اور ہے اس کا مقدر ہے مٹنا
جس کو ہونا ہے پہ نہیں ہے، رہ نہیں پائے گا وہ نہاں

عشق سراپا نظر بنا ہے اک دیدار کی لذت سے
حسن سدا مشتاقِ نمود ہے، ہونا ہوگا اسے عیاں

آہ! وہ دھرتی جس پر میں نے خون کے آنسو روئے ہیں
میرے آنسو اُس کے جگر میں بن جائیں گے لعلِ گراں

"مژدۂ صبح ان کالی کالی راتوں ہی میں ہے پنہاں
شمع جونہی دم توڑتی ہے تو سورج کا ملتا ہے نشاں"
(غالبؔ)

○

آزادیِ بحر

کہا بط نے ہُوا ہے بحر آزاد
یہی فرمان آیا ہے خضر کا

مگر مچھ نے کہا چاہے جہاں جا
پہ مجھ سے بے خبر ہو کر نہ جانا!

○

جمعیت الاقوام

تا کہ اس دنیا سے ہو جنگ و جدل کا خاتمہ
وردِ مندان جہاں نے طرحِ نو رکھّی جدا
میں بس اتنا جانتا ہوں، کچھ کفن چوروں نے کی
بہرِ تقسیمِ قبور اک انجمن آراستہ

○

شوپن ہار و نیٹشا

مرغِ چمن وہ سیرِ چمن کے لئے اڑا
اک خار اس کے پیکرِ نازک میں چبھ گیا
بولا : ہے فطرتِ چمن روز گار بد
کھاتا تھا گاہ اپنا وہ غم ، گاہ غیر کا
غنچہ کھلا تو بجھا فریب بہار ہے
اک داغ بے گناہی کا لالہ اسے لگا
بولا : کہ اس سرائے کی بنیاد ہی ہے کج
ہر صبح کی جبیں پہ ہے اک داغ شام کا
روتا تھا حسبِ حوصلہ ہر دم وہ نغمہ گر
خوں ہو کے نغمہ آنکھوں سے اس کی رواں ہوا
اس کی فغاں کو سن ، دلِ ہدہد ہوا دونیم
اس کے بدن سے کھینچ کے کانٹا جدا کیا
بولا : زیاں کی جیب سے حاصل کر اپنا سود
گل نے شگافِ سینہ سے پیدا نہ زر کیا
درماں بنالے درد کو ، گر خستہ تن ہے تو
خوگر ہو خار کا تو سراپا چمن ہے تو

لیگ آف نیشنز ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۶ء (مترجم)

○

فلسفہ و سیاست

فلسفی کو اور سیاست داں کو ہم پلّہ نہ جان
آنکھ اس سورج کی اندھی، تم نہیں اس میں دخیل

لائے وہ کم زور حجت قولِ حق کے واسطے
یہ تراشے قولِ باطل کے لئے محکم دلیل

○

صحبتِ رفتگاں
(عالمِ بالا میں)
ٹالسٹائے

شہر یاروں کے ہیں لشکر خادمانِ اہرمن
صرف روٹی کے لئے تیغِ ستم کھینچے ہوئے

حبِّ غیر ان پر کرے ہے دوستوں کا خوں حلال
زشت، نیک انکی نظر میں اور غافل مغز سے

ہیں یہ بے ہوشی کی مئے تاج و کلیسا و وطن
جاں خریدی خواجہ نے بدلے میں صرف اک جام کے!

کارل مارکس

راز دانِ جزو و کل اپنے سے نامحرم ہوا
حبِّ سرمایہ میں آدم، قاتلِ آدم ہوا

۱- سرمایہ دار

کارل مارکس: (۱۸۱۸ - ۱۸۸۳ء) جرمنی کا مشہور ماہر اقتصادیات جس نے سرمایہ داری کے خلاف قلمی جہاد کیا- اس کی مشہور کتاب موسوم بہ "سرمایہ" کو مذہب اشتراک کی بائبل تصور کرنا چاہیئے- (اقبال)

ہیگل

معنیِ مستور ہے جلوہ دہ باغ و راغ
دیکھ حقیقت میں ایک حنظل[1] و انگور کو ۔ !

فطرتِ اضداد نے لذتِ پیکار دی
خواجہ[2] و مزدور کو ، آمر و مامور کو ۔ !

ٹالسٹائے

عقل دورو[3] نے جنا فلسفۂ خود پرست
درسِ رضا دیتا ہے بندۂ مزدور کو ؟

مزدک

خاکِ ایراں میں جو میں نے بیج بویا تھا کبھی
کشت زارِ زار و قیصر میں ہوا ہے بارور

قصرِ سلطانی میں رقص مرگ دیکھا چاہیئے
میرو سلطاں کے لبوں پر الاماں والحذر !

آتشِ نمرود میں تھا مدتوں سوزاں خلیل
تب کہیں جاکر حرم سے بت ہوئے بیرونِ در

دور پرویزی گیا، اے کشتۂ پرویز اٹھ !
نعمتِ گم گشتہ اپنی چھین پنجہ موڑ کر

۱- اندرائن (ایک کڑوا پھل) ۲- سرمایہ دار ۳- دو چہروں والی ، دو رنگی عقل

کوہکن

سادہ ہے معشوق میرا اور کم آمیز ہے
فتنہ انگیز و ستیزہ کیش و ظلم انگیز ہے

دیکھنے میں ہے ہمہ بزم ، اور اندر سے ہے رزم
ہے زباں اس کی مسیح اور دل بڑا چنگیز ہے

دیدہ پگھلایا ، خرد کھوئی ، جنوں اپنالیا
جلوہ فرما ہو ، مری جاں شوق سے لبریز ہے

میرے تیشے نے اگرچہ کوہ سارا ڈھا دیا
گردشِ دوراں ابھی تک ہمدمِ پرویز ہے

فرش سے تا عرش ہر شئے راہ پیما ہے یہاں
یوں ہی چلتا رہ ! کہ چال اس کارواں کی تیز ہے

○

جلالؒ و ہیگل

ناخنِ فکر سے میں کھولتا تھا عقدہ ہائے حکیم المانی[1]
ابدی کو برہنہ اس نے کیا پیرہن جس کے تن پہ تھا آنی[2]
اس کی موج خیال کے آگے ہوئی گیتی کو تنگ دامانی
اس کے دریا میں پانو رکھتے ہی ہوئی کشتی عقل طوفانی
اس کے افسوں نے بند کی یوں آنکھ کوئی باقی رہا نہ کچھ فانی
نیند میں چشم شوق تیز ہوئی جلوہ فرما تھے پیرِ یزدانی[3]
ہوا جس مہر کی تجلی سے افق روم و شام نورانی
اس کا شعلہ جہانِ تیرہ[4] میں دشت میں اک چراغ رہبانی
حرف سے اس کے معنی اگتے ہیں جس طرح لالہ ہائے نعمانی
مجھ سے بولے "یہ نیند کیا ہے؟ اٹھ! تو نے سمجھا سراب کو پانی

راہِ عشق اور عصائے عقلِ کج؟
ڈھونڈتا ہے چراغ سے سورج؟"

○

نیٹشا

سستی انساں کے عناصر میں جو دیکھی، پھٹ پڑا
فلسفی نے ڈالی اک مضبوط پیکر کی بنا

سینکڑوں آشوب اٹھائے تازہ تر افرنگ میں
کارگاہِ شیشہ گر میں گویا اک دیوانہ تھا

۱- جرمن فلسفی ہیگل ۲- لمحاتی، فانی ۳- مولانا روم ۴- تاریک

○

حکیم آئن سٹائن[۱]

طالبِ جلوہ ہے وہ مثلِ کلیمِ ناصبور
فاش یوں روشن ضمیر اس کا کرے اسرارِ نور

ایک پل میں آسماں سے چشمِ آدم تک چلے
نور کی رفتار ایسی جس میں عاجز ہے شعور

جائے خلوت میں تو معدن میں بنائے کوئلہ
اور جلوت میں شجر جلنے لگے بالائے طور

نزد و دور و دیر و زود و پست و بالا سے بلند
اس طلسم چند و چون و بیش و کم میں بے مرور[۰]

تار و شید[۰۰] و سوز و ساز و مرگ و زیست اس میں حلول
سوز اس کا اہرمن ، ہیں ساز میں جبریل و حور

کیا بتاؤں اس حکیم نکتہ ور[×] کا میں مقام
نسلِ موسیٰ[۰۰۰] میں کیا زرتشت نے گویا ظہور

۱۔ جرمنی کا مشہور ماہر ریاضیات و طبیعات جس نے حال میں نظریہ اضافیت کا حیرت انگیز انکشاف کیا ہے۔ (اقبال)

۰۔ بے تغیر و تبدل ۰۰ تاریکی اور روشنی ۰۰۰ یہودی النسل

(×) ایران کا مشہور حکیم (۹۰۰ ق م تا ۸۰۰ ق م) مسئلہ نور کا اولین علمبردار ، جس کے پیرو بعد میں آفتاب پرستی اور آتش پرستی کا شکار ہوگئے (دیکھیے طاسین زرتشت (جاوید نامہ) (مترجم)

بائرن

خاکِ گلشن پر اگر اک قطرہ اس کے جام سے
گر پڑے تو لالۂ و گل کی طرح شعلے اگیں

ناموافق تھی اسے افرنگ کی ٹھنڈی ہوا
خود محبت چیخ اٹھی ، تھا سوز وہ پیغام میں

کس پری خانے کی نیو اس کے تخیل نے رکھی
نوجواں اک جلوے سے اس کے بہک کر گر پڑیں

طائرِ معنی خود اپنا آشیانہ چھوڑ کر
پھنس گیا خود آکر اس کے حلقہ ہائے دام میں !

انگلستان کا مشہور شاعر (۱۷۸۸ء - ۱۸۲۴ء)

نیٹشا

ہے اگر نغمے کا خواہاں تو ، گریزاں اس سے ہو
کیونکہ بجلی کی کڑک اس نے کے قلم کی لَے میں ہے

قلبِ مغرب میں اتارا اس نے اپنا نیشتر
اس کے دونوں ہاتھ ہیں خونِ چلیپا* سے رنگے

طرحِ بت خانہ رکھی اس نے بہ اندازِ حرم
گو دماغ اس کا ہے کافر ، پھر بھی مومن قلب ہے !

ہاں ! جلادے خود کو اس کی آتش نمرود میں
گلشن ابراہیمؔ کا ہوتا ہے پیدا آگ سے !

○

---

* یعنی صلیب مراد عیسائیت جس کا نٹشا نے رد کیا (م ۔ م)

نوٹ : نیٹشا نے مسیحی فلسفۂ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے اس کا دماغ اس لئے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے گو بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت قریب ہیں "قلب او مومن دماغش کافر است" نبی کریمؐ نے اس قسم کا جملہ امیہ ابن الصلت (عرب شاعر) کی نسبت کہا تھا آمن لسانہ و کفر قلبہ (اقبال)

پٹوفی

(ہنگری کا جواں مرگ شاعر جو وطن کی حمایت کے معرکۂ کارزار میں مارا گیا
اس کی نعش نہیں مل سکی کہ کوئی اسکی یادگار بنائی جا سکے)

عروسِ گل کے نغمے لے کر اس گلشن میں تو آیا
مٹایا ایک غم اور ایک غم ہر دل میں بھڑکایا

کفِ لالہ میں پھر مہندی رچائی خون سے اپنے
فغانِ صبح گاہی سے دلِ ہر غنچہ اکسایا

ہوا اپنی نوا میں گم سخن ہی تیرا مرقد ہے
ہنیں تھا تو زمیں سے، سو ترا مرقد نہ بن پایا

فرانسیسی فلسفی آگسٹس کومٹ اور مزدور کے درمیان ایک مکالمہ

کومٹ

سب اک دوسرے ہی کے اعضا ہیں ہم
کہ ہیں ایک ہی نخل کے برگ و بار

اگر پانو چلتے ہوں، سوچیں دماغ
تو سارا یہ فطرت کا ہے کاروبار

کوئی کار فرما کوئی کارساز
کرے کیسے محمود کارِ ایاز

ہوا ہے یہ تقسیم سب کارِ زیست
سراپا چمن ہو گیا خارِ زیست

مزدور

نہ دے مجھ کو اتنا فریب اے حکیم
ہے مشکل شکستِ طلسمِ قدیم[1]

مسِ[2] خام پر آبِ زر تو چڑھائے
مجھے صرف گردن جھکانا سکھائے

مرا یم[3] کرے آب جو میں اسیر
نکالوں میں، لے جائے تو جوئے شیر

دلاتا ہے خسرو کو اے نکتہ سنج!
حقِ کوہکن اور بلا جھیلے رنج؟

نہ حکمت سے ٹھہرا خطا کو صواب
خضر کو نہ لا زیرِ دامِ سراب

زمیں کا ہے بوجھ ایک سرمایہ دار
فقط کھائے اور سوئے وہ ہیچ کار

یہ خوش حالیاں جگ کی اے کم نظر!
ہیں مزدور کی محنتوں کا ثمر

نہیں جانتا تو کہ سرمایہ دار
حقیقت میں ہے چور بھی کم عیار

کرے جرم کو اس کے پوزش[4] عطا
یہ ایں عقل دھوکا بھی تو کھا گیا؟

۱- پرانا نظام ۲- تانبہ ۳- سمندر ۴- عذر، معذرت

ہیگل

اگرچہ اس کی حکمت تو بہت معقول ہے لیکن
نہیں اس کو میسر خلوتِ "محسوس" جانا نہ

وہ اس کا طائرِ فکر فلک پیما تو ایسا ہے
کہ جیسے بیضۂ بے مرغ زرخیزی سے بیگانہ

جلال[۱] و گوئٹے

نکتہ دانِ المنی[۲] وہ خوش نوا! حضرت رومی سے جنت میں ملا
شاعروں میں شاعرِ عالی جناب ہیں نہ پیغمبر پہ ہیں صاحب کتاب
قصۂ[۳] پیمانِ ابلیس و حکیم سن کے وہ دانائے اسرار قدیم
بولے: ہے تیرا سخن جاں کی بہار تو فرشتہ صید اور یزداں شکار
کنجِ دل میں فکر تیری گوشہ گیر عمرِ تازہ پا گئی دنیائے پیر
تن میں دیکھا سوز و سازِ جاں ادھر دیکھی سیپی میں بھی تعمیرِ گہر
سب تو رمزِ عشق سے آگہ نہیں وا ہر اک پر یہ درِ درگہ نہیں

ہے جو محرم راز کا یہ جانتا ہے بس وہی
عشق آدم سے ہے اور ابلیس سے ہے زیرکی! (رومی)

نوٹ: نکتہ دانِ المنی سے مراد گوئٹے ہے جس کا ڈرامہ "فاوسٹ" مشہور و معروف ہے۔ اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم "فاوسٹ" اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن خیال میں نہیں آ سکتا۔ (اقبال)

مرغی اگر بغیر قربتِ مرغ انڈا دے تو اس سے چوزے نہیں نکلتے (مترجم)

۱- جرمنی ۲- گوئٹے ۳- گوئٹے کی مشہور تصنیف "فاوسٹ" مراد ہے۔ (مترجم)

پیغامِ برگساں

تا تجھ پہ آشکار ہو ہر رازِ زندگی
شعلے سے خود کو دور مثالِ شرر نہ کر

نظارہ کر فقط نگہِ آشنا کے ساتھ
اپنے وطن میں بن کے بدیسی گزر نہ کر

ہے نقش تیرا بستۂ اوہام باطل اب
وہ عقل لا کہ دل سے جو سیکھے ذرا ادب

○

میخانۂ فرنگ

اف وہ دن خم خانۂ افرنگ میں تھا میں، جہاں
جام تھا روشن تر از آئینۂ اسکندری

مئے فروشوں کی نظر میں بادہ تھا پروردگار
چشمِ ساقی مئے کشوں کی کرتی تھی پیغمبری

جلوہ اس کا بے کلیمؑ اور شعلہ اس کا بے خلیلؑ
عقل کا مقصد متاعِ عشق کی غارتگری

آہ بے تابانہ کی گرمی سے تھی خالی ہوا
لغزشِ مستانہ سے ہر رند واں محروم تھا

○

مسولینی و قیصرِ ولیم

مسولینی

وہ دن گئے کہ جب اس دیرِ کہنہ میں آدم
مثال دانے کی، چکی میں پستا رہتا تھا
فریبِ زار[1] و افسونِ قیصری کھاتا
بچارا دامِ کلیسا میں جکڑا رہتا تھا
کیا ہے چاک اسے بھوکے غلام نے آخر
ہمارے خوں سے رنگا جس کا کُرتا رہتا تھا

آتشِ جمہور میں ہر کہنہ ساماں جل گیا
ہو قبا سلطاں کی یا پیرِ کلیسا کی رِدا!

قیصرِ ولیم

گناہِ عشوہ و نازِ بتاں کیا لگانا پھیرے خوئے برہمن ہے
خدا وندان نو ہر دم تراشے کہ بیزار از خدایانِ کہن ہے
ستم کا رہزنوں کے شکوہ کیسا کہ رہرو آپ اپنا راہ زن ہے
اگر جمہور پہنے تاجِ خسرو وہی ہنگامہ آرا انجمن ہے
ہوس مرتی نہیں آدم کے دل میں وہی آتش درونِ مرزغن[2] ہے
عروسِ اقتدارِ سحر فن کو وہی پیچاکِ زلف پر شکن ہے
نہیں ہے نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو نہیں تو کوہکن ہے!

۱۔ زار روس ۲۔ آتش دان [illegible] دیکھیے اشارات

حکما

(بزمِ فلسفیاں)

لاک[1]

اس کا ساغر ہے سحر کے بادۂ خورشید سے روشن تمام
ورنہ محفل میں تو آیا تھا لئے لالہ تہی سا ایک جام

کانٹ[2]

فطرت اس کی لائی ہے ذوقِ مئے آئینہ فام
اور شبستانِ ازل سے اک ستارہ جیسا جام

برگساں[3]

اس نے لائی ہے ازل سے مئے نہ لایا کوئی جام
لالے نے داغِ جگر سے لایا ہے سوزِ دوام

○

۱۔ انگریز فلسفی ۲۔ جرمن فلسفی ۳۔ فرانسیسی فلسفی

شعرا

بروننگ

بے پشت ہے جو بادہ سر جوشِ زندگی کا
آبِ خضر کو لیکر ساغر میں ڈالتا ہوں

بائرن

احسان کیوں خضر کا کوئی مری بلا لے
پانی جگر سے لے کر ساغر میں ڈالتا ہوں

غالب

"تا بادہ تلخ تر ہو اور سینہ ریش تر ہو
پگھلا کے آبگینہ ساغر میں ڈالتا ہوں"

رومی

آمیزشیں کہاں اور پاکی کہاں گہر کی
لیتا ہوں تاک سے راست ساغر میں ڈالتا ہوں

نقل و لوازمات سے محروم

خراباتِ فرنگ

رات کی بات ہے کل ، سوئے خراباتِ فرنگ
یہ مرا ذوقِ تماشا مجھے لے کر پہونچا

شوخ گفتار وہاں رند ملا اک مجھکو
اس کی کچھ باتوں نے گرویدہ بنایا اپنا

بولا : " پیارے ! یہ کلیسا تو نہیں ہے کہ یہاں
صحبت زہرہ و شاں ہے نہ سرود و نغمہ

ہے خراباتِ فرنگ اور یہاں ملتی ہے وہ مئے
جس کے پینے سے برا بھی نظر آتا ہے بھلا

نیک و بدکا یہاں پیمانہ ذرا اور ہی ہے
کہ ترازوئے نصاریٰ و یہودی میں ہے پاسنگ بڑا

خوب ہے زشت اگر اس کا نتیجہ ہو شکست
زشت ہے خوب جو ہو تاب و تواں تیری سوا

غور سے دیکھ حیات ایک ریاکاری ہے
مٹ گیا وہ کہ رہا جو گروِ صدق و صفا

پیرو مرشد کا ہمارے ہے یہ قولِ فیصل
مثل چاندی کے مس خام کو اپنے چمکا

دعویٔ صدق و صفا کچھ بھی نہیں ، کچھ بھی نہیں
کچھ اگر ہے تو ہے ناموسِ ریا کا پردا

کہہ گیا ہوں یہ کچھ اسرارِ نہاں خانۂ زیست
باندھ کر رکھ لے گرہ میں ، نہ کر ان کو افشا

انگلستان سے خطاب

اہلِ مشرق نے چکھی مینائے افرنگی سے مئے
توبۂ دیرینہ توڑی ہے تو حیرت اس میں کیا

فکرِ نو نے اس کی سیکھا شیوۂ تدبیرِ نو
خون ، قسمت کے پجاری کی رگوں میں بول اٹھا

ساقیا ! اس شورشِ مستاں سے مت ہو تنگدل
خود بتا انصاف سے ، یہ سب کھڑا کس نے کیا

وہ تو خود ہے بوئے گل ہی سوئے گلشن رہنما
ورنہ ، اک گلشن بھی ہے ، بلبل کو اس کا علم کیا !

○

قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور

مجھ سے ہے کارخانۂ آہنگری کا شور
گل بانگِ ارغنونِ کلیسا ترے لیئے

میرا وہ نخل جس سے کہ لیتا ہے شہ خراج
باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ ترے لیئے

تلخابہ وہ ہے میرے لئے ، دردِ سر جولائے
صہبائے پاکِ آدم و حوّا ترے لیئے

مرغابی و تدروؔ و کبوتر مرا نصیب
ظلِ ہما و شہپرِ عنقا ترے لیئے

یہ خاک اور اس میں ہے جو کچھ مرا نصیب
از خاک تا بہ عرشِ معلّٰی ترے لیئے

○

نوائے مزدور

یہ مجھ غریب کی محنت کشی کا ہے انعام
ملا ہے خواجۂ ناکارہ کو لباسِ حریر!

ہے حاکموں کی انگوٹھی میں میرے خون کی لہر
ہے میرے بچے کے آنسو سے سب شکوہِ امیر

مرے لہو سے کلیسا ہے جونک سا فربہ!
ہے میری قوتِ بازو سے سلطنت ہمہ گیر

خرابہ رشکِ چمن گریۂ سحر سے مرے
شباب پھولوں کا میرے جگر کے پانی سے

اٹھو کہ ساز سے اب تازہ نغمہ پھوٹا ہے
وہ مئے جو شیشے کو پگھلادے اس سے جام بھریں

نیا نظام کوئی لائیں میکدے کے لئیے
جو میکدے ہیں پرانے اب ان کو دھکا دیں!

چمن کے راہزنوں سے ہے انتقام کا وقت
گلوں کی بزم میں آ! اک نئی طرح ڈالیں

طوافِ شمع میں پروانہ ساں جیئیں کب تک
خود اپنے آپ سے بیگانہ ساں جیئیں کب تک

متفرقات

(گہر ریزے)

(۱)

دیکھ ہر ذرہ ہمارا کھارہا ہے پیچ و تاب
اف یہ ہر اک سانس جیسے اک قیامت کی گھڑی
خضر نے ظلمات میں اک دن سکندر سے کہا
موت مشکل ہے پہ مشکل اور بھی ہے زندگی

(۲)

موتی ہے ادا شناسِ دریا ، لیکن
چکی کی وہ گردشوں کو کیا جانے

(۳)

کلک[1] اندر سے ہے خالی اس لئے ہے نالہ زن
سرمئی پنسل مگر کرتا نہیں شور صریر

(۴)

آستیں میں رکھ کے بت میں نے کیا طوف حرم
میں نے ہی آگے بتوں کے نعرہ ہائے ھو لگائے
اک تقاضا جستجو کا دل میں باقی ہے ابھی
بال سے باریک رستے پر قدم میں نے اٹھائے

۱۔ قلم

(۵)

گل بولا کہ عیشِ نو بہاراں اچھا
اک صبحِ چمن برسوں ، مہینوں سے بھلی
قبل اس کے کہ رکھ لے تجھے دستار میں کوئی
خود شاخ سے گر کے جان دیدے اپنی !

(۶)

بچہ ، بوڑھا ، بڑا ، جوان
کوئی بھی ہوسکتا ہے سخن گو !
یعنی سخن گوئی کے لیئے تم
سال و ماہ کی قید نہ رکھّو !

(۷)

تین چیزوں سے اضافہ ہوتا ہے بینائی میں
یعنی سبزہ ، بہتا پانی اور کسی کا روئے خوش
تین یہ چیزیں یونہی کرتی ہیں فربہ جسم کو
ریشمی کپڑا ، طرب انگیزیاں ، اور بوئے خوش

(۸)

اے برادر ! زندگی کا تجھ کو دیتا ہوں نشاں
نیند ہلکی موت ہے اور موت ہے خواب گراں

(۹)

طاقتِ عفو اگر نہیں تجھ میں
اٹھ کے ہو دشمنوں سے صف آرا
سینے میں دے جگہ نہ کینے کو
سرکہ کو اپنے شہد میں نہ ملا!

(۱۰)

یہ نزاکت اور یہ شاعر کی طبعِ موشگاف
ایک جھونکے سے ہوا کے اس کا ٹوٹے آئینہ
کیسے کرسکتا ہے شرحِ کارزارِ زندگی
بلبلہ دریا میں ٹوٹا اس کا رنگ اڑنے لگا!

(۱۱)

اس جہاں میں اک کہستانی ندی کی طرح سے
راہ کے ہر اک بلند و پست سے آگاہ ہو
یہ نہیں ممکن تو بن جا ایک سیلِ بے اماں
لا نہ خاطر میں کسی پست و بلندِ راہ کو!

(۱۲)

پھول چننا ہے تو نوکِ خار کا شکوہ نہ کر
خار بھی تو ہے بہاروں ہی کا پالا اے پسر!

(۱۳)

کیوں لگاتا ہے یہ اپنے ریش و ابرو پر خضاب
کیا چرانے سے یہ ماہ وسال آتا ہے شباب

(۱۴)

دوں ہمتوں کو عشق بناتا نہیں ہے یار
شاہیں تدرو مردہ کا کرتا نہیں شکار

(۱۵)

نقدِ شاعر یعنی شعر و شاعری
زیست کے بازار میں چلتی نہیں
نسترن کے پھول کے بدلے میاں !
کیا کوئی روٹی خریدے ہے کہیں !

(۱۶)

مناسب ہے جو مردِ نیک کوئی
پرانے توڑ کر سب بند نکلے
اگر تقلید ہوتی شیوۂ خوب
پیمبر بھی رہِ اجداد چلتے

اشارات

سلسلہ نمبر	صفحہ نمبر	شخصیت	عنوان نظم	تشریح
۱-	۲۱	امیر امان اللہ خاں	پیش کش	امیر کابل ۱۹۱۹ء میں تخت نشین ہوئے انگریزوں کے خلاف جنگ کی اور انھیں شکست دی، انگریزوں نے شکست کھاکر افغانستان کی آزادی کو تسلیم کرلیا۔ امیر موصوف نے پھر ملکی اصلاحات کی طرف توجہ دی لیکن طبقۂ علماء نے ان کی اصلاحی تحریکوں کو ناکام بنادیا اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی بدولت تخت سے دست برداری اور جلاوطنی کے شکار ہوئے اور اقبال کی یہ "پیش کش" رائیگاں گئی۔ وائے بر آرزو کہ خاک شدہ شاید اسی پس منظر میں اقبال نے کہا تھا میں جانتا ہوں انجام اس کا جس معرکے میں ملا ہوں غازی لطف تو یہ ہے کہ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ انھیں علاماؤں اور ملاؤں نے پچھلے چند سالوں میں افغانستان کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کردیا ہے۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!
۲-	۲۵	شہنشاہ مراد	پیش کش	سلطان مراد، ترک حکمراں۔ اس لقب کے پانچ حکمراں گذرے ہیں۔ پتہ نہیں اقبال کی مراد کون ہے۔
۳-	۲۵	سلمان فارسیؓ	پیش کش	مشہور صحابی رسولؐ جو بعد میں مدائن کے گورنر ہوئے جو اپنی فقر اور سادگی کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ اقبال کے نہایت پسندیدہ کرداروں میں سے ایک اہم کردار
۴-	۹۳	بوعلی سینا	کتاب کا کیڑا	ابو علی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا (۳۷۰ھ - ۴۲۸ھ) دنیائے اسلام کا نامور فلسفی، بخارا میں پیدا ہوا۔ اس کی تصانیف میں اشارات الشفا (۱۸ جلد) نجات اور قانون بہت مشہور ہیں۔ موخر الذکر کتاب پچھلی صدی تک یوروپی جامعات میں پڑھائی جاتی تھی۔
۵-	۹۳	فاریابی	،،	ظہیر الدین ظاہر بن محمد فاریابی (وفات ۱۲۰۱ء) بارہویں صدی کا مشہور فارسی شاعر
۶-	۱۱۶	گوئٹے		جوہان وولف گانگ گوئٹے (۱۷۴۹ - ۱۸۳۲ء) جرمن شاعر، ڈرامہ نگار، ناول نگار اور فلسفی تفصیلات کے لئے دیکھئے دیباچہ کتاب از علامہ اقبال اور حاشیہ زیر نظم جلال و گوئٹے
	۱۱۹		(۱) حور و شاعر	
	۱۸۵		(۲) نغمہ محمدؐ	
			(۳) جلال و گوئٹے	
۷-	۱۱۸	ہائنا	زندگی و عمل	جرمنی کا مشہور اسرائیلی شاعر ہینریخ ہائنا (۱۷۹۷ء - ۱۸۵۶ء) عشقیہ شاعری کا امام جس کا نٹشا تک معترف تھا۔

۸-	۱۱۸	عالم گیر کا بیٹا	عالم گیر کا خط	دوسرا بیٹا ابوالمعظم شمس الدین محمد جو شاہ عالم بہادر شاہ اول کے لقب سے ۱۷۰۷ء میں تخت نشین ہوا اپنے باپ کی درازی عمر سے تنگ آگیا تھا ایک خانگی مجلس میں اپنے مصاحبوں سے یہ بات کہی کہ عالم گیر جلد دنیا سے اٹھے کہ اس کی دلی آرزوئے تخت نشینی برآئے کہ اس کی عمر پچپن سے تجاوز کر چکی تھی۔ عالم گیر کی خفیہ اتنی کارکردگی تھی کہ اس بات کی اطلاع اسے ہو گئی جس کے جواب میں اس نے اپنے بیٹے کو جو خط لکھا اسی کو اقبال نے نظم کیا ہے۔
۹-	۱۲۵	غنی کشمیری	غنی کشمیری	مرزا محمد طاہر غنی کشمیری (۱۰۳۹ء - ۱۰۷۹ھ) عہد عالمگیری کا ایک نہایت خوددار اور قناعت پسند شاعر تھا عالمگیر کی طلبی پر کہلوادیا کہ دیوانہ ہو گیا ہے اور واقعی دیوانہ ہو کر تین چار روز بعد بہ عمر ۴۰ سال وفات پائی۔ سری نگر میں مدفون ہے۔ اس نظم میں اس کے ایک قول کو نظم کیا گیا ہے۔
۱۰-	۱۲۶	مصطفیٰ کمال پاشا	مصطفیٰ کمال پاشا	ترکی کا مشہور جابر اور مطلق العنان حکمراں جس نے جولائی ۱۹۲۲ء میں یونانیوں کے خلاف جارحانہ اقدام شروع کیا اور ستمبر ۱۹۲۲ء میں سمرنا فتح کر لیا جس پر اسے اتاترک (پدر قوم) کے لقب سے نوازا گیا اور سارے عالم اسلام میں جشن چراغاں منایا گیا۔ یہ نظم اسی وقت کی یادگار ہے لیکن جس نے بعد میں علماؤں اور ملاؤں کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر (جو کہانی ان دنوں افغانستان میں دہرائی جارہی ہے) ایک سیکولر اسٹیٹ کے قیام کا اعلان کیا تو اقبال بڑے مایوس بھی ہوئے اور یہ شعر کہا نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
۱۱-	۱۷۵	شوپن ہار	شوپن ہار و نٹشا	جرمنی کا مشہور فلسفی (۱۷۸۸ء - ۱۸۶۰ء) جس کے فلسفے میں انسانی ارادے کو جو انسان کو زندہ رہنے پر مجبور کرتا ہے، وہی مرکزی حیثیت حاصل ہے جو مذہب میں خدا کو دی جاتی ہے لیکن انسانی ماحول حصول آرزو میں رکاوٹ ہے۔ زندگی سراسر کلفت، رنج و الم اور مصیبت کا نام ہے۔ ہم زندگی بھر موت سے برسرپیکار رہتے ہیں اور انجام کار وہ ہم پر غالب آجاتی ہے عورت کو وہ فساد کی جڑ قرار دیتا ہے کہ اس کی وجہ سے زندگی کا تسلسل باقی ہے ہماری شاعری میں اس کے فلسفے کو فانی بدایونی نے بڑے جمالیاتی اظہار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

۱۲-	۱۷۵ ۱۸۲	نطشا	اشوپن ہار و نطشا ۲ نطشا	جرمنی کا مشہور فلسفی (۱۸۴۴ء-۱۸۹۹ء) شوپن ہار کا شاگرد لیکن اپنے استاد کے برعکس اس نے اثبات حیات کا درس دیا فوق البشر کا نظریہ پیش کیا کہ طاقت حاصل کرو اور کمزوروں پر حکومت کرو۔ اس نظم میں مرغ چمن، شوپن ہار اور ہد ہد نطشا کی علامت بہ طور استعمال ہوئے ہیں۔ (دیکھئے حاشیہ صفحہ ۱۸۲)
۱۳-	۱۷۶	ٹالسٹائے	صحبت رفتگاں	کاونٹ لیوٹالسٹائے (۱۸۲۸ء - ۱۸۸۲ء) روس کا مشہور مصلح جس نے یوروپ کی سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی (اقبال)
۱۴-	۱۷۶	کارل مارکس	صحبت رفتگاں	(دیکھئے حاشیہ صفحہ ۱۷۶)
۱۵-	۱۷۷ ۱۷۹	ہیگل	(۱) " (۲) جلال و ہیگل	ہیگل: (۱۷۷۰ء-۱۸۳۱ء) جرمنی کا مشہور و معروف فلسفی جو کہتا ہے کہ تناقض یا تضاد اس کائنات کی بنیاد اور اصل حیات ہے جس پر کیمونسٹ نظریہ سازوں نے جدلیاتی مادہ پرستی کی بنیاد رکھی جب کہ خود ہیگل بڑا پکا مذہبی مسیحی عقیدہ رکھتا تھا۔
۱۶-	۱۷۷	مزدک	صحبت رفتگاں	مزدک: زرتشی مذہب کا مبلغ، ایران قدیم کا فلسفی (وفات ۵۳۸ء) جو زن، زر اور زمین کو فساد کی جڑ بتلاتا تھا اور ان تینوں کی منصفانہ طریقے سے تقسیم کا حامی تھا گویا اس کا فلسفہ موجودہ کیمونسٹ تحریک کی ابتدائی شکل تھا۔
۱۷-	۱۸۰	آئن سٹائن	آئن سٹائن	(دیکھئے حاشیہ صفحہ ۱۸۰)
۱۸-	۱۸۱	بائرن	(۱) بائرن (۲) شعرا	لارڈ بائرن: (۱۷۸۸ء-۱۸۲۴ء) مشہور انگریزی شاعر جس کی شاعری جذبہ بغاوت انانیت، زور کلام اور سوز و گداز سے عبارت ہے۔ اپنے ہی جگر سے کشید کرنے میں اس کی انانیت کی طرف اشارہ ہے۔
۱۹-	۱۸۳	پٹوفی	پٹوفی	الیگر نڈر پٹوفی ہنگری کا جوانامرگ شاعر جس نے شہنشاہیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جس کی پاداش میں گھر سے نکالا گیا۔ سخت عسرت اور فاقہ کشی کی مصیبتیں جھیلیں۔ اس نے جہاں فطرت پرستی اور جوش تخیل سے معمور نظمیں لکھیں وہیں باغیانہ شاعری بھی کی اور آخر کار ۳۱/ جولائی ۱۸۴۸ء کو ملوکیت کے خلاف معرکہ کارزار میں مارا گیا۔
۲۰-	۱۸۳	کومٹ	ایک مکالمہ	فرانسیسی فلسفی آگسٹس کومٹ (۱۷۹۸ء-۱۸۵۷ء) فلسفہ اثباتیت (POSITIVISM) کا بانی جو کائنات کے ظواہر سے بحث کرتا ہے اور تصوریت کی ضد ہے اس نے انسان کو انسانیت کی پرستش کی تعلیم دی۔
۲۱-	۱۸۰ ۱۸۸	برگساں	(۱) پیغام برگساں (۲) حکما	ہنری برگساں: (۱۸۵۹ء-۱۹۴۱ء) مشہور فرانسیسی فلسفی جس کے نزدیک تغیر مسلسل ہی قانون حیات ہے جس میں تکرار نہیں، سائنس اور عقل حقیقت کی دسترس سے باہر ہیں صرف وجدان سے حقیقت کا ادراک ممکن ہے۔ کائنات اپنے جوش نمود

				ELAN_VITA سے ارتقا پذیر ہے جس کو اقبال نے لالے کے داغ جگر کے سوز دوام کا نام دیا ہے۔
۲۲۔	۱۸۷	موسیولنین	موسیولینین و قیصر ولیم	لنین: صدر جمہوریہ اشتراکیہ روسیہ (۱۸۷۰ء - ۱۹۲۴ء)
۲۳۔	۱۸۷	قیصر ولیم		قیصر ولیم: فریڈرک ولہلم جو قیصر ولیم ثانی کے نام سے جانا جاتا ہے (۱۸۵۹ء - ۱۹۳۱ء) ۱۹۱۴ء میں دوسری جنگ عظیم اسی نے چھیڑی تھی۔ اقبال نے اس کو ملوکیت کے نمائندہ بہ طور پیش کیا ہے۔
۲۴۔	۱۸۸	لاک	حکما	**جان لاک:** (۱۶۷۸ء - ۱۸۰۴ء) مشہور انگریز فلسفی جو صرف حواس خمسہ اور مشاہدات ہی کو علم کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ ذہن انسانی سادہ صفحے کے مانند ہے حواس اور مشاہدہ اس کے سامنے جو کچھ لاتے ہیں وہ ذہن انسانی پر نقش ہو جاتا ہے۔ "بادۂ خورشید" اور "لالہ تہی جام" کے استعاروں میں اقبال نے اس کا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔
۲۵۔	۱۸۸	کانٹ	حکما	ایمانوئیل کانٹ: (۱۷۲۴ء - ۱۸۰۴ء) مشہور جرمن فلسفی جس کے "فلسفۂ عقل محض" سے مراد، لاک کے برعکس وہ تصورات ہیں جو حواس خمسہ پر مبنی نہیں بلکہ جو فطری طور پر انسان لے کر پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ انسانی فکر ذات واجب کا اثبات نہیں کر سکتی صرف اخلاقی حاسہ اور ضمیر کی آواز ہی سے یہ ممکن ہے جس کے لئے اقبال نے ستارہ جیسا جام (کوکب جام) کا استعارہ استعمال کیا ہے۔
۲۶۔	۱۸۹	براوننگ	شعرا	رابرٹ براوننگ: (۱۸۱۲ء - ۱۸۸۵ء) مشہور انگریزی شاعر جس کی شاعری ایک واضح پیغام، امید، رجائیت سعی پیہم اور جد و جہد کی علمبردار ہے اقبال نے "خضر" کو سعی پیہم اور تگاپوئے دمادم کے استعارہ بہ طور استعمال کیا ہے۔
۲۷۔	۱۸۹	غالب	شعرا	مرزا غالب (۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء) جس کے نزدیک لطف زندگی سراپا سوز و گداز ہو جانے اور ساغر حیات کو پگھلا کر پی جانے میں ہے۔
۲۸۔	۱۸۹	رومی	شعرا	مولانا رومی (۱۲۰۷ء - ۱۲۷۳ء) اقبال کے روحانی مرشد اور رہنما جو کسی آمیزش کے بغیر اور راست تاک (یعنی ذات واجب) سے کشید کرنے کے قائل ہیں۔

PAYAM-E-MASHRIQ (IQBAL)

Versified Translation

by

MUZTAR MAJAZ

.... Since Persian is no longer as well known in India and Pakistan as it was during Iqbal's time, a Urdu translation is most welcome-all the more when it is made by a scholar and poet of the calibre of Muztar Majaz who has all necessary equipment to take up the difficult task of presenting a versified Urdu rendition of this great work of Iqbal. ....

Prof. ANNEMARIE SCHIMMEL,
On
Translation of Javidnama

"....... ضمیر اقبال تک پہونچنے کے لئے مضطر مجاز نے بڑی روحانی اور شعری جہد کی ہے، جس کے بغیر وہ شائد ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔

اقبال کی فارسی تخلیق کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے فارسی اور اردو کے محاورے سے واقفیت کافی نہیں، زبان سے دل تک پہونچنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ مضطر میں یہ صلاحیت موجود ہے، جس کا اندازہ ان کے ترجموں کی بے ساختگی اور روانی سے ہوتا ہے۔

مضطر اس روحانی اور شعری تہذیب سے واقف ہیں اقبال جس کے اس صدی میں سب سے بڑے وارث تھے۔ ان کے ترجمے ان بد نصیبوں کو جو اس تہذیب کی زبان سے واقف نہیں ہیں، اس کی روح تک پہونچنے میں رہنمائی کرتے ہیں......."

عالم خوند میری / ترجمۂ ارمغان حجاز